قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا پچھترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اکتوبر 2018ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

حدیث نبوی ﷺ

رسول اللہ (ﷺ) نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز بتاؤں جو نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی افضل ہے۔ صحابہؓ نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ چیز ہے باہمی تعلقات کا درست رکھنا۔''

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اکتوبر 2018ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 10

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: ریاستِ مدینہ کی دو نمایاں خصوصیات	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	4
سائنٹفک تحقیق اور اجتہاد	ڈاکٹر عبدالودود	11
آخری سہارے۔۔۔آپ بیتی	عنایت اللہ	15
ریاستِ مدینہ	خواجہ ازہر عباس، کراچی	26
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا، نشست نمبر:10	محمد علی صابر صدیقی	35
دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	39
بچوں کا صفحہ: دوسروں کے لئے جیو	ادارہ	55

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) **Chapter 3: Spring's Message**
(***Payam-e Fasl-e Bahar*** پیام فصل بہار) **– Message to Fellow-Ambassadors**
By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **60**

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ریاستِ مدینہ کی دو نمایاں خصوصیات

ادارہ طلوعِ اسلام کا ملکی یا غیر ملکی کسی بھی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی طلوعِ اسلام خود کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ ہے۔ یہ صرف اور صرف ایک فکری اور علمی تحریک ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ کریم میں دی گئی اقدار پر علیٰ وجہِ البصیرت ایمان لانے کی دعوت دیتی ہے تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافتِ علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔

حالیہ عام انتخابات منعقدہ 25 جولائی 2018ء میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والی سیاسی جماعت ''پاکستان تحریکِ انصاف'' کے قائد جناب عمران خان نے 26 جولائی 2018ء کی سہ پہر پاکستانی قوم سے پہلا خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''میں سیاست میں اس لئے آیا کہ میں نے پاکستان کو اوپر جاتے اور نیچے آتے ہوئے دیکھا۔ یہاں کرپشن، اور گورنینس کا نظام بہتر نہیں تھا۔ میں پاکستان کو قائداعظم کا پاکستان بنانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔ انہوں نے کہا کہ میں جس شخصیت سے متاثر ہوں، وہ نبی کریم ﷺ ہیں۔ انہوں نے انسانیت کا ایسا نظام رائج کیا جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ میں پاکستان کو ایسی فلاحی ریاست بنانا چاہتا ہوں جس طرح ہمارے نبی ﷺ نے بنائی تھی۔ لیکن ہماری ریاست میں یہ نظام اُلٹا ہے۔
>
> جہاں آدھی سے زیادہ آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا نظام ہے۔۔۔۔۔۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم لڑائیوں کو ختم کرنے والا ملک بنیں گے، شرکت کرنے والا نہیں۔''(1)

یہ بات بڑی خوش آئند ہے۔

جناب نبی کریم ﷺ نے جو فلاحی ریاست بنائی تھی، علاوہ کئی گونہ دیگر خوبیوں کے اس کی دو نمایاں خصوصیات یہ تھیں:

1۔ اس معاشرہ میں تنہا رہ جانے والے (یتیم) کو دھکے نہیں ملتے تھے اور مسکین کے کھانے کا بندوبست کرنے کے لئے پوری اُمت ایک نظام (صلوٰۃ) کے ذریعے اس کی ذمہ داری قبول کرتی اور باہم معاونت سے اس کو پورا کرتی تھی تاکہ رات کو

(1) بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ 27 جولائی 2018ء صفحہ نمبر 1 کے تسلسل میں صفحہ نمبر 19۔

کوئی شخص بھوکا نہ سوئے۔

2۔ پوری اُمت میں وحدت تھی اور اس میں کوئی سیاسی پارٹی اور مذہبی فرقہ نہ تھا۔ اس وحدتِ فکر و عمل کے خلاف ہر خیال اور کوشش کو ''شرک'' سمجھا جاتا تھا۔

ان دونوں خصوصیات کی بنیاد، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآنِ کریم کے واضح احکامات تھے جن کا مختصر تذکرہ درجِ ذیل ہے:

پہلی بات

(ا) نوعِ انسان کو سامانِ زیست (رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لے رکھی ہے۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ ۔۔۔ (6:151) نیز (17:31)

ترجمہ: ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

یہی نہیں بلکہ ہر ذی حیات کے رزق کا ذمہ بھی اللہ پر ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)

ترجمہ: اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اللہ ہی کے ذمہ اس کا رزق ہے۔

جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہو، اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ انسانوں (اور دیگر مخلوق) کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں خدا تعالیٰ نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ انہیں پورا کرے۔ لہٰذا اسلامی فلاحی ریاست کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کو یقینی بنائے۔

اس بنا پر ضروری ہے کہ آئین کی رُو سے جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے، ان میں اس شق کا اضافہ کیا جائے۔

رزق (سامانِ زیست) کا حق:

افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی (بشمول وہ اسباب و ذرائع جو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں جیسے تعلیم و تربیت) بہم پہنچائی جائیں گی۔ لیکن یہ حق مشروط ہے اُس شرط کے ساتھ کہ کام کرنے کے قابل ہر فرد، اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق وہ کام سرانجام دے جسے اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

(ب) قرآنِ کریم کی سورہ الماعون (نمبر 107) میں یوں ارشاد ہے:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧

کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعنی اس کا طرزِ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دین داری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا

ہے، تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے (53:33، 95:7، 33-75:32)۔

(دین کا مقصد یہ تھا کہ معاشرہ میں جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے اسے محسوس نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا اور بے کس ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے، کسی کی کوئی ضرورت رُک جائے تو اُسے فوراً پورا کر دیا جائے۔ لیکن) اس دیندار کی حالت یہ ہے کہ جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے، یہ اُسے دھکے دیتا ہے، اور محتاجوں کی مدد نہ خود کرتا ہے، نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے (89:18، 69:34)۔

کام تو ایسے کرتا ہے، لیکن اپنے آپ کو ''دیندار'' ظاہر کرنے کے لئے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کے نمازی ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں؛ اس لئے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی، پرہیزگار ہیں۔

انہیں اس کا پتا ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد تھا ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں اور عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشوونما بہم پہنچتا رہے۔ یہ اس کی اس غرض وغایت سے تو غافل رہتے ہیں اور اس کے محسوس ارکان (قیام، رکوع، سجود وغیرہ) کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضہ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے (9:54)۔

ان کی اس خود فریبی کا نتیجہ ہے کہ یہ ایک طرف نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور دوسری طرف رزق کے اُن سرچشموں پر، جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لئے کھلا رہنا چاہئے، بند لگا کر، ان پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں، اور اس طرح ضرورت مندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں (یوں یہ تکذیبِ دین کرتے اور ننگِ اسلام بنتے ہیں)۔

نبیٔ کریم ﷺ کے انداز کی فلاحی ریاست بنانے کے لئے بہت محنت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان 1973ء کے آرٹیکل 38 (د) میں ضروری ترمیمات کرنا ہونگی تاکہ اس میں قرآنی معنوں میں ''یتیم اور مسکین'' کا اضافہ کیا جائے اور اس کی محض اخلاقی حیثیت کی بجائے، عملی اور حقیقی یقین دہانی کے لئے لوکل گورنمنٹ قوانین میں ترامیم کے ذریعے، عوامی لوکل نمائندوں کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ مزید یہ کہ مفت خوروں اور منگتوں کی جماعتوں اور ان کے سرپرست ٹھیکیداروں سے عوام کی جان چھڑائی جائے۔ اس بارے میں مناسب قانون سازی درکار ہوگی اور نگرانی واحتساب کا ایک نظام قائم کرنا ہوگا۔

دوسری بات ہے وحدتِ امت (وحدتِ فکر و عمل)

تمام انبیاء کرام کا ایک ہی ''دین'' رہا ہے:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟ (3:19)

ترجمہ: دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اس دین کو اجتماعی حیثیت سے معاشرہ میں نافذ کرنا۔ قائم کرنا، سب انبیاءؑ کا مشن رہا ہے چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ ..... (42:13)

ترجمہ: اس اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا کہ:

دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو

مشرکوں کو وہ بڑا گراں معلوم ہوتا ہے جس کی طرف آپؐ انہیں بلاتے ہیں۔''

اس آیۂ کریمہ کی رُو سے تمام جلیل القدر پیغمبروں کو صرف ایک حکم دیا گیا تھا کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ یعنی دین (اللہ کے قانون) کو نافذ کرو اور صرف ایک وارننگ دی گئی تھی کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ لیکن جو لوگ انبیاءؑ کے لائے ہوئے دین پر نہ چلے اور نہ چلتے ہیں، انہیں یہ تفرقہ نہ ڈالنے کی بات، بڑی گراں گزرتی ہے۔ بیشک یہ لوگ مشرک ہیں۔ یعنی دین میں تفرقہ ڈالنا ''شرک'' ہے۔

دوسری جگہ سورۃ الروم میں ارشاد ہے:

..... وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۳۱ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۳۲ (30:31-32)

ترجمہ: ''۔۔۔۔۔ اور مشرکوں میں سے نہ ہو جانا یعنی ان میں سے جنہوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقے فرقے بن گئے۔ سب گروہ، اس پر جو ان کے پاس ہے، خوش ہو رہے ہیں۔''

دین میں تفرقہ پیدا کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اسے کرنے والے کا نبیٔ کریم ﷺ سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ ..... (6:159)

ترجمہ: ''وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور کئی فرقے ہو گئے، تیرا (اے نبی ﷺ!) ان سے کوئی سروکار نہیں۔۔۔''

اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اس کی رسی (قرآنِ کریم) کو مضبوطی سے تھام لو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ (3:103)

ترجمہ: ''اور سب کے سب اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے بچا لیا۔''

قرآن کریم میں مزید ارشاد ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (3:105)

ترجمہ: ''اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی آیات آ چکی تھیں اور انہی کے لئے بڑا عذاب ہے۔''

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (16:64) (نیز دیکھیں (2:213))

ترجمہ: اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تُو ان کے لئے وہ باتیں کھول کر بیان کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ ضابطۂ قوانین (دین) کو ماننے والے لوگ ہی ایک اُمت بنتے ہیں۔ قوم کی وحدت کا انحصار قانون کی وحدت پر ہوتا ہے۔ چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی ضابطۂ قوانین (قرآن مجید) کی اطاعت لازم قرار دی گئی ہے (5:48-49) اس لئے ان میں تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو ایسا کرتے ہیں، قرآن انہیں مشرک قرار دیتا ہے۔

قرآن کریم میں نہ تو شخصی (Personal Laws) اور تمدنی قوانین (Public Laws) کی تفریق کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں مختلف فرقوں کے لئے مختلف فقہوں کا کوئی تصور ہے۔ اُمت میں فرقوں کا وجود اس کی نصِ صریح کی رو سے شرک ہے (30:31) اور چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت نہیں، اس لئے جس طرح مذہبی فرقوں کا وجود از روئے قرآن شرک ہے، اسی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی یکسر خلافِ اسلام۔ قرآنِ کریم نے اسے سیاستِ فرعونی سے تعبیر کیا ہے (28:4) سیاسی پارٹیوں سے متعلق آرٹیکل 17(2) میں بھی ترمیم، ضروری ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ بحالاتِ موجودہ مذہبی فرقہ بندی کے شرک کو بیک جنبش قلم نہیں ہٹایا جا سکتا۔ اگر قرآنِ کریم کی اساس پر ملک کا قانون مرتب کیا جائے تو اس کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں طور پر ہو سکے گا۔ اس سے فرقہ بندی کی گرہیں خود بخود ڈھیلی پڑ جائیں گی۔

اس وقت آئینِ پاکستان کا آرٹیکل 227 درج ذیل ہے:

Provisions relating to the Holy Qur'an and Sunnah.

(1) All existing laws shall be brought in conformity with the Injuncations of Islam as laid down in the Holy Qur'an and Sunnah, In this Part (Part IX) referred to as the Injunctions of Islam, and no law shall be enacted which is repugnant to such Injunctions.

[Explanation -- In the application of this clause to the personal law of any Muslim sect, the expression "Qur'an and Sunnah" shall mean the Qur'an and Sunnah as interpreted by that sect.]

پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 227 کی وضاحت موجودہ مذہبی فرقوں کو قانونی جواز فراہم کرتی ہے جسے قرآنِ کریم نے شرک قرار دیا تھا ہر فرقہ کی مزعومہ سنت کو وہ مقام دیتی ہے جو قرآنِ کریم نے اسے نہیں دیا۔ یہ شق صریحاً فرقہ بند مشرکوں کے دباؤ پر شاملِ آئین کی گئی تھی، اسے ختم ہونا چاہئے۔

ان ترامیم کے علاوہ تعلیم کا انتظام اس طرح سے کیا جائے کہ مذہبی اور سیکولر تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی تنویت ختم کر کے بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے ان میں عام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کی بلند اقدار کا شعور بھی پیدا ہوتا چلا جائے۔ اس طرح ان کے دل و دماغ سے فرقہ وارانہ امتیازات کی لکیریں خود بخود مٹتی چلی جائیں۔

مذہبی فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے بُرے اثرات کو زائل کرنے کے لئے جتنی بھی کوششیں کی جائیں، وہ مستحسن ہونگی لیکن وہ لوگ جن کے مفاد مذہبی فرقہ بندی یا سیاسی پارٹیوں سے وابستہ ہیں، وہ اس اس تبدیلی اور دین الحق کے نفاذ کو آسانی سے روبعمل نہیں آنے دیں گے۔ قرآنِ کریم نے ان کی واضح نشاندہی کی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (9:34)

''ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو (جان لو کہ) یقیناً بہت سے علماء اور راہب لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔''

اکثر علماء اور تصوّف کے علمبرداروں کا اپنا وسیلۂ رزق نہیں ہوتا۔ اسی طرح سرمایہ پرست بھی دوسروں کی کمائی پر پلتا ہے۔ یہ لوگ طرح طرح کے بہانے بنا کر دین الحق کے رائج ہونے میں حائل ہوتے اور اللہ کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کام کے لئے طرح طرح کے بہروپ دھارتے ہیں اور پاک بازی کی قسمیں کھا کر لوگوں کو اپنی

(1) Added by the Constitution (Third Amendment) Order, 1980.w.e.f. 17 Sept. 1980

اچھائی اور نیکی کا یقین دلاتے ہیں لیکن اندر سے یہ عوام الناس کو تفرقہ بازی پر ابھارتے ہیں اور تفریق بین المومنین کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہے کہ انہوں نے ایک مسجد بنانے کے ''عملِ صالح'' کے پیچھے آڑ لی تھی:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ (9:107) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ ۔۔۔(9:108)

ترجمہ: اور (کچھ وہ ہیں) جنہوں نے ضرر، کفر اور مومنوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے مسجد بنائی اور اس شخص کے گھات کی جگہ جس نے پہلے سے اللہ اور رسول کے ساتھ لڑائی کی اور وہ یقیناً قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ سوائے بھلائی کے اور کچھ نہ تھا اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ (9:107) اس مسجد میں کبھی نہ کھڑا ہونا۔ (9:108)

مندرجہ بالا آیتوں سے واضح ہدایت ملتی ہے کہ فرقہ بند مشرکین طرح طرح کے حربوں سے دین الحق کے نفاذ کی مخالفت کریں گے۔ ان سے ہوشیار رہنا، ان کا ساتھ نہ دینا۔ ان کے فریب میں نہ آنا۔

بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ

''جس مملکت میں داخلی طور پر انتشار ہوتا ہے، فکر و عمل میں وحدت نہیں ہوتی، اس کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں اندر کی طرف سمٹنے لگتی ہیں اور جس مملکت میں وحدتِ فکر و عمل ہوتی ہے، تفرقہ بازی نہیں ہوتی، اس کے داخل میں امن و سکون ہوتا ہے اور اس کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں باہر کی طرف پھیلتی ہیں۔''

تمام قوموں کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

توجہ فرمائیے

اس امر کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ ادارہ طلوع اسلام کا ملکی یا غیر ملکی کسی بھی سیاسی پارٹی یا فرقہ سے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی ادارہ طلوع اسلام خود کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ ہے۔ یہ صرف اور صرف ایک فکری اور علمی تحریک ہے۔ (چیئرمین ادارہ)

ڈاکٹر عبدالودود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سائنٹفک تحقیق اور اجتہاد

قرآن مجید نے مومنین کی خصوصیات کے ضمن میں کہا ہے کہ یہ وہ صاحبانِ عقل و بصیرت (لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۙ﴿۱۹۰﴾) ہیں یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ جو زندگی کے ہر نہج میں قوانینِ خداوندی کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ (3:190-191) ''اور تخلیقِ ارض وسما میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔'' مقام فخر ومسرت ہے کہ ہمارے اربابِ علم میں ایک ہستی ایسی رہی ہے جسے مبداءِ فیض نے ان مومنانہ خصوصیات سے نوازا تھا۔ ان کے سینے میں قلبِ سلیم تابندہ تھا اور دماغ میں شمعِ بصیرت روشن۔ وہ ایک طرف آیاتِ قرآنی پر مصروفِ غور وفکر رہتے اور دوسری طرف کارگہۂ کائنات پر مشغولِ تحقیق وتدقیق۔ اس کا اولین ثمر ان کی مایۂ ناز تصنیف۔(Phenomena of Nature and the Quran) ہے جو مغربی اربابِ فکر وتحقیق تک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ ہیں ڈاکٹر عبدالودود صاحب۔

سائنس کی تحقیق اولیں قدم پر ہی یقین کے درجے تک نہیں پہنچ جاتی۔ اس میں مسلسل مشاہدات وتجربات بھی ہوتے رہتے ہیں اور مزید غور وتفکر بھی۔ اس طرح اس تحقیق کے اسقام واغلاط کی تصحیح ہوتی رہتی ہے۔ یہی وہ انداز اجتہاد ہے جسے قرآن کریم بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَالَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ؕ (29:69) جو لوگ تلاشِ حقیقت میں مصروفِ جدوجہد رہتے ہیں (مسلسل اجتہاد کرتے رہتے ہیں) ہم ان کے سامنے حقیقت تک پہنچنے کی راہیں کشادہ کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی تحقیق کے سابقہ سقم کو تسلیم اور اس کی اصلاح کرنے کے لئے بڑی کشادہ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں سائنسدان وہی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت موجود ہو۔ اسی قسم کے سائنسدان تھے جن کی کشادہ نگہی کے طفیل، سائنٹفک تحقیقات یقین کے درجے تک پہنچتی گئیں۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو فطرت نے اس قسم کی کشادہ نگہی بھی عطا

کی تھی جس کی ایک شہادت ان کا ذیل کا مختصر سا مقالہ ہے جسے ہم بمسرت شائع کرتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ قرآن اور سائنس سے دلچسپی رکھنے والے اربابِ علم اسے مفید پائیں گے۔

(طلوعِ اسلام)

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اپنے مطالب خود واضح کرتا ہے۔ جوں جوں انسان غور کرتا ہے مطالب خود بخود نکھر کر سامنے آتے جاتے ہیں۔ اس وقت میرے زیرِ نظر ''سماء الدنیا'' اور ''کوکب'' کے الفاظ ہیں۔ مندرجہ ذیل دو آیت میں ''سماء کا لفظ آتا ہے: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔۔۔ (2 2 :2) اور وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (41:12) میں نے اپنی کتاب (Phenomena of Nature and the Quran) میں سماء الدنیا سے مراد وہ آسمان لیا تھا جہاں تک انسان کی نگاہ پہنچتی ہے۔ میری اس فکر کی بنیاد یہ تھی کہ آیت (2:22) میں سماء سے مراد وہ آسمان ہے جہاں سے پانی برستا ہے۔ اسے سائنس کی اصطلاح میں (Trophosphere) کہتے ہیں جو سطح زمین سے سات میل اوپر تک جاتا ہے۔ دوسری طرف آیت (41:12) میں سماء الدنیا سے وہ آسمان مراد ہے جہاں ستارے موجود ہیں جو سطح زمین سے اربوں میل دور ہیں۔ گویا جہاں تک انسان کی نگاہ جاتی ہے یہ سماء الدنیا ہے۔

اب اس کے بعد آیت (37:6-7) اس آیت میں مصابیح کی بجائے لفظ کواکب آیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مصابیح اور کواکب کے الفاظ ہم معنی ہیں اور کیا دونوں سے مراد ستارے ہیں؟ کوکب (جمع کواکب) سے عام مراد ستارے ہی لیا جاتا ہے اور میں بھی اس سے یہی معنی اخذ کرتا رہا ہوں۔ لیکن ڈاکٹر (Maurice Bucaille) نے اپنی کتاب (The Bible, The Quran and Science) میں ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ انہوں نے کوکب سے مراد (ستارہ نہیں) (Planet) لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا نکتہ نظر درست ہے۔ میری نگاہ وہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ انہوں نے کوکب کے معنی (Planet) آیت (24:35) کی بنا پر لئے ہیں۔ ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ'' (24:35) اس آیت میں مصباح اور کوکب دونوں الفاظ آئے ہیں۔ (مصباح) چراغ (زجاجۃ) شیشے کے اندر بند ہے اور شیشے کی (Reflected Light) کی وجہ سے نور میں اس قدر شدت پیدا ہوگئی ہے کہ ''نور علی نور'' ہوگیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ (Reflected Light) صرف (Planet) کی ہوتی ہے۔ ستارے کی روشنی (Reflected) نہیں ہوتی۔ ستارہ اپنی روشنی خود پیدا کرتا ہے۔ (Marmaduk Pickthal) نے بھی کوکب کا ترجمہ (Planet) کیا ہے[1] لیکن جب تک واضح نہ کیا

(1) مصر کے ڈاکٹر محمد احمد الغمر اوی (مرحوم) نے اس بحث کو اپنی کتاب (Islam in the scientific era) میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ مارماڈیوک پکھتال نے اپنے ترجمہ قرآن میں لکھا ہے کہ انہوں نے مصر میں ڈاکٹر الغمر اوی سے کافی استفادہ کیا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

جائے کہ ستارے اور (Planet) کی روشنی میں فرق کیا ہے بات سمجھ میں نہیں آتی۔

چنانچہ اگر ''کوکب'' کے معنی (Planet) ہیں تو پھر

اسلام کے دشمن

''اسلام کے دشمن دانستہ، اور نادان دوست نادانستہ، ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں قرآنی نظام ناقابلِ عمل ہے۔ تاریخ کے ایک دور میں تو اس نے شاندار نتائج پیدا کر دکھائے تھے۔ لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب یہ ''چلا ہوا کارتوس'' کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرسکتا۔ یہ آوازیں اِدھر اُدھر سے سنائی دے رہی ہیں اور عوام کے دلوں میں مایوسی پیدا کئے چلی جارہی ہیں۔ آپ احباب کی ذمہ داری ہے کہ زمانہ کو بتادیں کہ جو کچھ قرآن نے ایک دور میں کیا تھا اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے اور ہمیشہ اس کی صلاحیت رہے گی کہ ویسے ہی درخشندہ نتائج پھر مرتب کر دکھائے۔'' (طلوعِ اسلام کنونشن، 1959ء)

مجھے سماء الدنیا کا مفہوم بھی بدلنا پڑے گا۔ اس لحاظ سے سماء الدنیا وہ آسمان نہیں جہاں تک ہماری نگاہ جاتی ہے اور جہاں ستارے موجود ہیں بلکہ وہی نزدیک کا آسمان ہے جس میں زمین پر زندگی کے لئے سامانِ حفاظت بھی موجود ہے اور جس کے اندر (Planets) بھی موجود ہیں۔ سامانِ حفاظت سماء الدنیا کے اس حصے میں موجود ہے جسے ہم زمین کا Atmosphere کہتے ہیں Atmosphere زمین کی سطح سے ایک ہزار (1000) میل اوپر تک جاتا ہے۔ اس کا وہ حصہ جس سے پانی برستا ہے (Trophosphere) زمین سے سات میل دور ہے اور جو ہوا کی (Convection Currents) کی وجہ سے زمین کی سطح پر درجہ حرارت کو اعتدال پر رکھتا ہے جس کے بغیر زندگی قائم نہیں رہ سکتی اس کے اوپر (Stratosphere)، 17 میل تک (Chemo sphere)، 45 میل تک اور (Idosphere)، 250 میل زمین سے اوپر تک جاتے ہیں۔ یہ حصے خلا میں سے زمین پر مار کرنے والی خطرناک (Radiation Waves) شعاعوں کو اور اوپر سے گرنے والے ذرات (Meteors) کو سطح زمین تک پہنچنے سے روکتے ہیں (تفصیل کے لئے میری کتاب صفحہ: 22-21 ملاحظہ فرمائیے)۔

(Planets) میں سے سورج سے نزدیک تریں (Mercury) ہے جو کہ 36 ملین میل کے فاصل پر ہے اور سب سے دور (Pluto) ہے جو 3666 ملین میل دور ہے۔ گو یہ فاصلے بھی عام نکتہ نظر سے بہت دور معلوم ہوتے ہیں لیکن زمین سے یا سورج سے ستاروں کے جو فاصلے ہیں ان کی نسبت سے یہ فاصلے کوئی حقیقت نہیں رکھتے مثلاً (Proxima Centauri) زمین سے نزدیک تریں ستاروں میں شمار ہوتا ہے اور اس کا فاصلہ زمین سے 4-1/2 (Light Years) ہے (لائٹ ائیر سے کیا مراد ہے؟ روشنی کی شعاع ایک سیکنڈ میں 180,000 میل کا فاصلہ طے کرتے ہے اور ایک

سال میں جس قدر فاصلہ طے کرتی ہے اسے (Light Year) کہتے ہیں) اب دیکھئے کہ وہ ستارہ جو سب سے زیادہ دور ہے اور جو آج تک (Astronomy) والے دریافت کر سکے ہیں وہ یہاں سے 2000 ملین (Light Years) دور ہے (گویا لائٹ ائیر کی اصطلاح کے بغیر اسے ہندسوں میں لکھنا بھی مشکل ہے) اکثر ستارے، جن کی روشنی آج ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہے یہ ان ستاروں سے اس وقت روانہ ہوئی تھی جب ابھی زمین معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ چنانچہ جہاں تک ہمارے زیرِ نظر موضوع کا تعلق ہے، سماء الدنیا، سے مراد وہی نزدیک کا آسمان ہے جس میں سامانِ حفاظت بھی ہے اور (Planets) بھی ہیں ستاروں والا آسمان بہت دور ہے۔ مصباح کے معنی چراغ ہیں چراغ کا لفظ عام معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے ستاروں کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور (Planets) کے لئے بھی۔ چنانچہ لفظ مصابیح آیت (41:12) اور لفظ کواکب آیت (37:6) میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ دونوں آیات میں مصابیح اور کواکب سے مراد (Planets) ہی ہیں ستارے نہیں ہیں۔

ضمناً آیت (6:77) میں جو کوکب کا لفظ آیا ہے (اور راغب کے حوالے سے جس کے معنی ظاہر ہونے اور چُھپنے والا ستارہ بیان کئے گئے ہیں) جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سے مراد کوئی خاص ستارہ نہیں کیونکہ ستارہ ہو یا (Planet) ظاہر ہونے اور (اَفَلَ) چُھپنے کا عمل ہر ایک کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ ظاہر اور چھپنے والے خاص کُروں کو (Comets) کہتے ہیں جن کا (Orbit) دائرہ حرکت، گول ہونے کے بجائے (Eliptical) ہوتا ہے یہ کرے (Solar System) میں شامل ہیں۔ قرآن نے اسے الجوار الکنس کہا ہے۔ اَلْ اس کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے اور بغیر روک ٹوک کے اس کی حرکت بھی جاری رہتی ہے اور لمبی مدت کے لئے یہ غائب بھی ہوجاتا ہے (Halley's Comet) سورج کے گرد اپنا چکر 76 سال میں پورا کرتا ہے اور اب 1986ء میں ظاہر ہونے والا ہے۔

(مطبوعہ: طلوعِ اسلام، فروری 1980ء)

ملتان کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



ملک محمد صفدر ایڈووکیٹ نمبر 54 محمڈن بلاک ضلع کچہری۔ ملتان فون نمبر: 0334-6093266

عنایت اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخری سہارے۔۔۔آپ بیتی

قارئین طلوعِ اسلام نے اس انداز کا کوئی مضمون اس سے پہلے طلوعِ اسلام میں نہیں دیکھا ہوگا انہیں ہماری اس ''بدعت'' پر حیرت تو ہوگی لیکن مضمون کی آخری سطروں تک پہنچتے پہنچتے وہ یقیناً ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ بدعت ''بدعتِ حسنہ'' ہے جو ''ثواب'' کا موجب ہوا کرتی ہے۔ دیکھئے! عنایت صاحب یہ آپ بیتی کس طرح بیان کرتے ہیں:

ریاض نے کہا تھا کہ:

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور　　نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

میکدے سے نکلنے کے بعد دنیا کس طرح بدل جاتی ہے، اس کا تو مجھے علم نہیں، لیکن میکدے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی انسان ایک ایسی دنیا میں کس طرح پہنچ جاتا ہے جس کا کوئی تعلق اس کی سابقہ دنیا سے نہیں رہتا، اس کا مجھے تجربہ ہے اور اسی تجربہ کے ایک گوشے سے میں قارئینِ طلوعِ اسلام کو متعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اس ''میکدہ'' اور باہر کی دنیا کے درمیان ایک بہت بڑی دیوار حائل ہوتی ہے۔ باہر والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس دیوار کے اس قدر بلند رکھنے سے مقصد یہ ہے کہ اندر کی دنیا والے اسے پھاند کر باہر نہ جاسکیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کی بھنک تک بھی اندر والوں کے کان میں نہ پڑنے پائے، قرآن نے بھی تو جنت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار ہی حائل بتائی ہے فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ (57:13) ''ان کے درمیان ایک دیوار حائل کردی جائے گی جس کا صرف ایک دروازہ ہوگا۔'' یوں تو اس دروازہ میں داخل ہونے کے ساتھ ہر ایک نئی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ لیکن جو بدبخت اس شدتِ احساس کے ساتھ اندر جائے کہ ــــ ایں طرفہ تماشہ بیں، ناکردہ گنہ گارے'' ــــ اس کے دل کی دنیا میں جو قیامت خیز تغیر آتا ہے اس کا اندازہ کوئی اور نہیں لگا سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس بلند دیوار اور اس کے آہنی پھاٹک کے پیچھے، بڑی بڑی لرزہ انگیز سزائیں اور ہولناک عقوبتیں سامنے آتی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ جگر پاش سزا بے بسی اور انتہائی مجبوری کا احساس ہے جو ایک بدروح کی طرح سوتے جاگتے، کسی وقت بھی قیدی کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اسی بے بسی کا اثر ہے کہ جب ان آہنی سلاخوں کے پیچھے اس پر پہلی رات ہی آتی ہے تو اسے خود اپنی ذات کے ہوحق ویرانے سے سب سے پہلے اپنے متعلق ایسی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں جو

وہ دوسروں کے متعلق دوسروں کو سنایا کرتا تھا۔ جو قصے کہانیاں وہ دوسروں کے ساتھ وابستہ کیا کرتا تھا وہی قصے کہانیاں اس کی اپنی داخلی دنیا سے ابھر کر اسی کے ساتھ چپکتے چلے جاتے ہیں۔ آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں ___ میں نے روکا نہیں تھا تمہیں؟ ۔۔۔ میں نے کہا نہیں تھا یوں نہ کرو؟ ۔۔۔ تم نے میری نہ مانی، من مانی کی ۔۔۔ آج تمہارے متعلق ہر جھوٹ سچ ہو گیا ہے ۔۔۔ قیدی ۔۔۔ مجرم ۔۔۔ قیدی۔

قیدی ان آوازوں سے بھاگ کر تنگ و تاریک کوٹھڑی کے کونوں کھدروں میں پناہ لیتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی ہستی سے اٹھتی ہوئی آوازیں شہد کی بپھری ہوئی مکھیوں کی طرح اس کے اوپر نیچے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ اس کے لئے سوائے اس کے کوئی راہِ فرار نہیں ہوتی کہ وہ تصوروں اور حسین یادوں میں گم ہو جائے یا اپنے آپ کو کسی ایسی غیبی قوت کے حوالے کر دے جو اسے اپنی گود میں اس طرح چھپا لے جس طرح بچپن میں جب بجلی کڑکتی تھی تو اُسے ماں سینے سے لگا کر اپنی پناہ میں لے لیا کرتی تھی۔

وہ ماضی میں جا چھپتا ہے۔ اُسے باتیں یاد آتی ہیں ___ کچھ بھولی بسری، کچھ کئی بار سُنی ہوئی۔ جرم سے پہلے کی کہانیاں سے پہلے کے قصے، اس سے بھی پہلے کی باتیں، بھولی بھالی معصوم سی وارداتیں ___ اس طرح وہ کہکشاں پر ٹہلتا ہوا ستاروں کے دیس سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ لیکن وارڈر کی وسل کی سخت، تیکھی آواز، یا چابیوں کے گچھے کی جھنجھناہٹ، یا کسی ساتھی قیدی کی بیڑیوں کی ہیبت ناک جھنکار، اُسے یوں کالی کوٹھڑی میں واپس لے آتی ہے جس طرح چیل مرغی کے بچے کو پنجوں میں دبوچے اپنے گھونسلے میں لا پھینکتی ہے۔ نزع کے وقت بھی شاید انسان اس قدر بے بس، مجبور اور رحم کا طلبگار نہ ہوتا ہوگا جتنا اس وقت ہوتا ہے جب اسے پُرفریب تصوروں کے سبزہ زار سے گھسیٹ کر حقائق کے ریگ زار میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ تڑپتا ہے۔ مر مر کے جیتا ہے اور جی جی کے مرتا ہے۔ اُسے اپنے آپ میں بھی پناہ نہیں ملتی وہ سہارے تلاش کرتا ہے یا شکست خوردہ ہو کر اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لینے کی کوشش کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے جب کسی بے گناہ کو سزائے قید دے دی جاتی ہے تو اس کی ذہنی حالت اس سے کہیں زیادہ دگرگوں اور قابلِ رحم ہوتی ہے۔ وہ تنکوں کے سہارے تلاش کرتا پھرتا ہے۔ جیل میں ڈوبتے ہوئے کو تنکوں کے سہارے مل ہی جاتے ہیں یا پھر اپنے ذہن کے تراشیدہ خدا کو خوش کرنے کے طریقے ایجاد کر لئے جاتے ہیں۔ اس ''خدا'' کو داڑھی سے، تسبیح کے دانوں سے، قرآن کی آیات کو گا گا کر پڑھنے سے اور پیر جی اور مُلا کے بتائے ہوئے دیگر طریقوں سے خوش کیا جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ سہارے جن میں سے کچھ کا ذکر اس وقت خود بخود دل کی گہرائیوں سے ابل کر صفحہ قرطاس پر بکھر رہا ہے۔

''یٰسین کی مبینیں پڑھو۔'' جب مجھے سات برس کے لئے محبوس کر دیا گیا تو ایک قیدی نے مجھے مشورہ دیا۔ ''یٰسین کو ڈھیلا نہ چھوڑنا۔ اس کی مبینیں قاتلِ کو سُولی سے اتار لیتی ہیں۔''

''میں یٰسین کو جانتا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اُس سے ملا دو۔ پوچھ لوں گا۔''

''آپ اتنے پڑھے لکھے ہو کر بھی یٰسین کو نہیں جانتے؟'' قیدی کا مُرجھایا ہوا چہرہ بپھر گیا۔ بولا۔'' کیسے مسلمان ہو کہ تمہیں سورۂ یٰسین بھی نہیں آتی؟''

میں بجھ کے رہ گیا میں نے جب اُسے بتایا کہ میں سورۂ یٰسین اچھی طرح جانتا ہوں تو اس نے مجھے بتایا کہ یوں کرو کہ علی الصبح سورۂ یٰسین پڑھا کرو۔ جب پہلی مبین پر پہنچو تو پھر واپس یٰسین پر آجاؤ اور بغیر بسم اللہ پڑھے شروع سے پڑھو۔ پہلی مبین پر پہنچو تو پھر واپس آجاؤ۔ بغیر بسم اللہ پڑھے تین بار یہ عمل کرو۔ تیسری مرتبہ دوسری مبین تک پہنچو تو وہاں سے پھر واپس آجاؤ۔ بغیر بسم اللہ پڑھے تین بار یٰسین سے دوسری مبین تک پڑھو۔ اس کے بعد یٰسین سے تیسری مبین تک آؤ۔ یہاں تکرار نہیں ہوگی پانچویں مبین پر تکرار ہوگی۔ تیسری بار بسم اللہ پڑھو اور چھٹی مبین پر تکرار ہوگی۔ اس کے بعد۔۔۔''

وہ مجھے قرآن کی اس سورۃ کے متعلق ایسے انداز اور ایسی اصطلاحوں کی زبان میں باتیں سنا رہا تھا جیسے کسی کالے جادو کا عمل اور اس کا اثر سکھا رہا ہو۔ میں اس سے کہنے ہی لگا تھا کہ قرآن کی یوں توہین نہ کرو۔ لیکن اس دوران میں دس بارہ قیدی ہمارے اردگرد جمع ہو چکے تھے اور وہ باری باری۔ ''یٰسین کی مبینوں'' کی کرامات اور معجزوں کے قصے سنانے لگ گئے تھے۔ اس مجمع میں تین چار آدمی ایسے تھی جو مبین کا نام لیتے یا سنتے وقت انگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگاتے تھے۔ ان میں سے جن کی ڈاڑھی تھی اور ہاتھ ڈاڑھی پر اور بغیر ڈاڑھی والے منہ پر ہاتھ پھیر لیتے تھے۔ ایک نے مجھے حلفیہ سنایا کہ ایک آدمی نے دن دہاڑے چار آدمیوں کو قتل کر دیا تھا وہ بوڑھی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ حوالاتی قیدی بن کر جیل میں آیا تو اس نے راتیں جاگ جاگ کر یٰسین کی مبینیں پڑھیں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو وہ جونہی عدالت میں داخل ہوا مجسٹریٹ غش کھا کر کرسی سے فرش پر جا پڑا۔ دوسری پیشی پر بھی ایسا ہوا۔ تیسری پیشی پر جب مجسٹریٹ گرنے لگا تو گرتے گرتے اُس نے لکھ دیا ___ ''مقدمہ خارج'' ___ اور قاتل صاف بری ہو گیا۔

اس کے بعد مجھے جرأت نہ ہوئی کہ انہیں قرآن کی توہین سے روکتا یا روک سکتا۔ ان معتقدوں میں زیادہ تر لمبی قید والے اور عمر قید والے اسیر تھے جنہوں نے ''یٰسین کی مبینیں'' اُس وقت پڑھنی شروع کی تھیں جب ان کے مقدمے شروع ہوئے تھے۔ اُس وقت بھی انہوں نے اس عمل کو جاری رکھا جب انہیں مجرم قرار دے کر طویل ترین سزائے قید دیدی گئی۔ اُس وقت بھی جب ان کی اپیلیں ہائی کورٹ نے پھر سپریم کورٹ نے مسترد کر دیں اور قانون اور انصاف نے ان پر ہمیشہ کے لئے دروازے بند کر دیئے۔ لیکن وہ ابھی تک یٰسین کی مبینوں کو ڈھیلا نہیں چھوڑ رہے۔ کیونکہ روایات کی زنجیریں جیل کی دیواروں اور سلاخوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں وہ ابھی تک اس اُمید کو سینوں میں سجائے ہوئے ہیں کہ ایک نہ ایک دن مجسٹریٹ بے ہوش ہو جائے گا اور گرتے گرتے ان کی رہائی کے احکام لکھ جائے گا۔

''اگر آپ یٰسین کا اثر دو دن کے اندر دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔'' ایک ڈاڑھی والے قیدی نے کہا۔'' تو اس ورد کے ساتھ ڈاڑھی رکھ لیں۔''

یہ ڈاڑھی والے حضرت سات سال کی سزا بھگت رہے تھے اور تین برس سے ڈاڑھی رکھ کر یٰسین کی مبینیں پڑھ رہے تھے۔ جیل میں ڈاڑھیوں کی تعداد غیر معمولی ہوتی ہے۔ ڈاڑھیوں کی وہاں تین قسمیں ہیں۔ ایک جو باہر بھی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ دوسری قسم جو جیل کے حجام کے کُند استرے سے بچنے کے لئے ڈاڑھی بڑھا لیتے ہیں (اور لگے ہاتھوں شریعت کا تقاضا بھی پورا ہو جاتا ہے) اور تیسری قسم ان سزا یافتہ قیدیوں اور حوالاتیوں کی ہوتی ہے جن کی اپیلیں یا مقدمے زیر سماعت ہوتے ہیں۔ اس تیسری قسم کی ایک مثال پیش کرتا ہوں (یہ مثال ایک نہیں، اکثریوں ہوتا ہے)۔

ایک پیشہ ور غنڈہ پانچ سال کی سزائے قید بھگت رہا تھا۔ اُس نے اِس سزا کے خلاف اپیل دائر کر رکھی تھی۔ میرے ساتھ وہ خاصا بے تکلف تھا۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا تین ساڑھے تین انچ ڈاڑھی سمیت دیکھا۔ ایک دن جو دیکھتا ہوں تو اسے پہچاننے میں خاصی دِقت ہوئی کیونکہ اس کی ڈاڑھی مونچھوں سمیت غائب تھی۔ میں نے پوچھا ___ ''کیوں پہلوان! ڈاڑھی کہاں گئی؟'' بڑے تحمل اور متانت سے بولا ___ ''بھاجی! کل اطلاع ملی ہے کہ ہائیکورٹ نے اپیل نامنظور کر کے سزا بحال رکھی ہے۔''

''آیۃ کریمہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔'' ایک اور سفید ریش نے سورہ یٰسین کو بھی الگ رکھتے ہوئے مجھے پُرزور مشورہ دیا کہ میں آیت کریمہ کا ورد ہر نماز کے بعد ایک سو ایک بار کیا کروں اور اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ اس نے بتایا ___ ''حضرت یونسؑ نے یہ آیت مچھلی کے پیٹ میں پڑھی تھی تو مچھلی نے انہیں خشکی پر اگل دیا تھا۔۔۔ میں گذشتہ چار برس سے اس آیت کا ورد بڑی باقاعدگی سے کر رہا ہوں۔''

میں نے جب اس کی سزا کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ساڑھے چار برس کی سزائے قید لے کر آیا تھا۔ جس میں سے وہ چار برس گذار چکا ہے۔ جب چھ ماہ بعد (سزا ختم ہونے کے بعد) اسے جیل اگل دے گی تو آیتِ کریمہ کی برکت پر کون یقین نہیں کرے گا۔

ہر نئے قیدی کو پُرانے قیدی ورد و وظیفے سکھا دیتے ہیں۔ مجھے بھی جیل میں کتنا ہی عرصہ سینکڑوں وظیفے سکھائے گئے ان میں سے صرف چند ایک پیش کرتا ہوں۔

''یہ یازدہ پارہ ہے۔۔۔'' ایک عمر قیدی نے مجھ پر کرم خاص کرتے ہوئے چھوٹی سی ایک کتاب مجھے دی اور کہا ___ میں آج کل قرآن ختم کر رہا ہوں۔ یہ یازدہ شریف تم لے لو اور ہر صبح گیارہ کی گیارہ سورتیں پڑھ لیا کرو۔ اگر عربی پڑھنا نہیں جانتے تو سطروں پر انگلی پھیر لیا کرو۔۔۔

لیکن یہ خیال رکھنا کہ اس میں سورہ نوح بھی ہے۔ یہ سورہ کبھی بھول کے بھی نہ پڑھنا بلکہ جب قرآن ختم کرو تو بھی سورہ نوح نہ پڑھا کرو۔ کیونکہ اس میں مصیبت ہی مصیبت اور بددعا ہی بددعا ہے اسے پڑھو گے تو بنے بنائے کام بگڑ جائیں گے۔

یہ خیال رہے کہ یہ قیدی اَن پڑھ نہیں تھا۔ انٹرمیڈیٹ تھا۔ ہر بات آدھی اردو اور آدھی انگلش میں کرتا تھا۔ اور وہ ایسی جماعت کا پیروکار تھا جو اسلام کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتی ہے اور جس کا امتیازی نشان مٹھی بھر سے بالشت بھر داڑھی ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ حضرت غبن اور فریب دہی (دفعہ 420) کے جرم میں محبوس تھے۔

وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ہم خیال اور بھی تھے اور سورۂ نوح کے متعلق مندرجہ بالا رائے ان کی اپنی نہیں تھی بلکہ ان کی جماعت کے سکہ بند مولویوں کی تھی۔

''میرے بھائی! کیوں جھک مارتے ہو۔۔۔'' ایک اور نسخہ ملا۔ ''خدا کی قسم! ایک طرف سارا قرآن اور دوسری طرف صرف سورہ مزمل، صبح سویرے اذان سے پہلے دو نفل پڑھ کے گیارہ مرتبہ سورہ مزمل پڑھ لیا کرو اور قطب کی طرف تین پھونکیں مار دیا کرو۔ پھر دیکھنا یہ ''سالی'' دیواریں نہ پھٹ جائیں تو میری ڈاڑھی پیشاب سے مونڈھ دینا۔''

میرے محتاط اندازے کے مطابق جیل میں ہر صبح کم و بیش پانچ سو قیدی گیارہ گیارہ مرتبہ سورہ مزمل (اوّل و آخر درود شریف) پڑھا کرتے تھے (اب بھی پڑھتے ہیں) گویا وہاں سورہ مزمل پانچ ہزار پانچ سو مرتبہ ہر صبح پڑھی جاتی تھی۔ لیکن دیواریں ''سالی'' نہیں پھٹیں اور یہ فقرہ کہ ''اگر اس سورہ کا یہ اثر نہ ہو تو میری ڈاڑھی پیشاب سے منڈوا دینا۔'' دن میں کوئی پچاس مرتبہ سننے میں آتا ہے لیکن دیواریں اپنی جگہ اور ڈاڑھیاں اپنی جگہ سلامت ہیں۔

''درود و وظیفے میں ایسے ایسے پرہیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' ایک تجربہ کار (بلکہ عادی) وظیفہ خواں نے مجھے وثوق سے بتایا۔۔۔'' جو جیل میں پورے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا وظیفے کا اثر الٹا ہو جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ قرآن ختم کرو۔ ایک بار نہیں جتنی بار کر سکو۔ پڑھنے سے تو قرآن دیر میں ختم ہوتا ہے۔ سطروں پر صرف انگلی پھیرتے جاؤ۔ انگلی پھیرنے سے پڑھنے جتنا ہی ثواب ہوتا ہے۔ اس طرح تم ایک رات میں ایک قرآن ختم کر سکتے ہو۔''

قرآن کا اثر میں بتاؤں؟ قریب بیٹھا ہوا ایک قیدی بول اٹھا۔ ''بمبئی میں میرا ایک دوست ہے۔ شراب وہ پیتا ہے جوا وہ کھیلتا ہے، رنڈیوں کے پاس وہ جاتا ہے۔ غرض کونسی بدکاری اور کونسا گناہ ہے جو وہ نہیں کرتا لیکن وہ ایک کام کرتا ہے۔۔۔'' قیدی نے وجد میں آتے ہوئے بتایا۔ ''اس نے ایک مولوی رکھا ہوا ہے جسے وہ تین سو روپے ماہوار دیتا ہے۔ اس مولوی کا کام صرف یہ ہے کہ جب وہ آدھی رات کے وقت شراب کے نشہ میں دُھت گھر آتا ہے تو مولوی قرآن کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور وہ آدمی قرآن سنتے سنتے سو جاتا ہے۔ مولوی قرآن پڑھتا رہتا ہے۔ جانتے ہو بابو! اس کا اثر کیا ہوتا ہے؟۔۔۔ اس نے میری پیٹھ پر تھپڑ نما تھپکی دے کر کہا۔ ''رات کو اُسے خواب میں سٹہ، لاٹری، ریس اور ڈربی اور لکی نمبر دکھائی دیتے ہیں جنہیں وہ صبح اٹھ کے لکھ لیتا ہے۔ وہ ان نمبروں پر پیسہ لگاتا ہے پھر کیا ہے بابو! ہر طرف سے دولت کی بارش ہونے لگتی ہے۔۔۔ یہ صرف قرآن کا اثر ہے بابو! صرف قرآن کا اثر۔''

جیل میں قرآن خوانی بہت ہوتی ہے جب قیدیوں کو جھاڑو دے کر جیل کی صفائی پر لگانے کا وقت آتا ہے تو قرآن

پڑھنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ تعداد جانتی ہے کہ دنیا کا کوئی قانون ان کے ہاتھ سے قرآن لے کر اس کی جگہ جھاڑو نہیں دے سکتا۔ جیل کے قوانین وضوابط اور افسر بھی اس صورت حال سے بے بس ہوجاتے ہیں۔ ایک افسر نے مجھ سے بصد افسوس کہا ''ہم جانتے ہیں کہ بارکوں میں قطار در قطار بیٹھے ہوئے یہ قرآن خواں قرآن پڑھنا نہیں جانتے یہ صرف کام اور صفائی سے بچنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ لیکن ہم ان کے ہاتھ سے قرآن چھین نہیں سکتے۔''

انسان جب حالات اور اپنے آپ سے شکست خوردہ ہوجاتا ہے، تمام سہارے اور پناہ گاہیں چھن جاتی ہیں اور جب اپنی ہی ذات لعن طعن شروع کردیتی ہے تو وہ ہر طرح کے جھوٹے سہارے قبول کرلیتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ ؎

یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی مگر جلے ہوئے تنکوں کو چُن رہا ہوں میں

اور جب مولوی کا وعظ اور روایات اور ان کا اثر باقاعدگی سے جیل میں پہنچ رہا ہو تو کون کافر کہہ سکتا ہے کہ یہ سہارے جھوٹے ہیں۔ ایسے ہی ایک سہارے کا ذکر کرتا ہوں۔

اُس وقت مجھے بی کلاس عطا کردی گئی تھی (بی کلاس میں سیاستدانوں، لیڈروں، ایڈیٹروں، سکہ بند مصنفوں، ادیبوں اور اس قماش کے لوگوں کو قید کیا جاتا ہے۔ الگ کمرہ مع ضروری فرنیچر اور لکھنے پڑھنے کی سہولتیں دی جاتی ہیں جیل کا اسٹاف احترام سے پیش آتا ہے) دو وارڈروں نے مجھ سے میرے کیس کے متعلق پوچھا۔ میں نے جب انہیں تفصیلات سنائیں تو دونوں نے وثوق سے مشورہ دیا کہ میں شاہ جی سے ضرور ملوں۔ شاہ جی کے متعلق انہوں نے بتایا ___ ''انہیں ملنا ہے تو دس روز کے اندر اندر مل لو ورنہ پچھتاؤ گے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کہیں باہر جارہے ہیں؟''

''نہیں!'' وارڈر نے بتایا۔ ''دسویں روز وہ پھانسی چڑھ رہے ہیں۔''

میں نے پھانسی کے لفظ پر حیرت کا اظہار کیا تو مجھے بتایا گیا کہ شاہ جی کو سزائے موت ہوئی ہے اور پھانسی کی تاریخ آچکی ہے شاہ جی کے معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی پھانسی کی کوٹھڑی (Condemned cell) کا دروازہ مقفل رہتا ہے لیکن وہ ہر شام اپنے پیر صاحب کے پاس چلے جاتے ہیں اور سارے شہر میں گھوم آتے ہیں۔ نماز باہر مسجد میں پڑھتے ہیں۔ وارڈروں کو وہ کوٹھری میں نظر آتے ہیں لیکن وہ دراصل باہر گئے ہوئے ہوتے ہیں۔

''تو وہ اسی کرامات سے فائدہ اٹھا کر پھانسی سے بچ کیوں نہیں جاتے؟'' میں نے پوچھا اور یہ بھی پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسی برگزیدہ شخصیت نے ایسا، جرم کیا ہی کیوں کہ انہیں سزائے موت مل گئی۔''

''اسی میں تو سارا راز ہے جو کسی کو معلوم نہیں۔'' وارڈر نے میرے سینے پر انگلی رکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔ پیری پیغمبری کے بعد کا درجہ قطب کا ہے۔ اس کے بعد کا درجہ خدا کا ہے۔ شاہ جی نے پہلے تمام درجے پالئے ہیں۔ لیکن قطب کا درجہ سولی پر چڑھ کے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ سولی پر چڑھ رہے ہیں۔۔۔ بابو صاحب! جانے کتنے قیدیوں کو وہ ایک ایک

پھونک سے بری کروا چکے ہیں۔ انہیں صرف اس مجسٹریٹ یا جج کا نام بتادو جس کے پاس مقدمہ چل رہا ہو۔ عدالت میں جاتے ہی اتنا کہہ دو۔ ''یا شاہ جی کر مدد۔'' اور مجسٹریٹ اندھا ہو جائے گا اور مقدمہ خارج کر دے گا۔''

پھانسی کی کوٹھڑیوں والے وارڈ میں کسی کا گذر نہیں ہوسکتا کڑے پہرے لگے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود عام قیدی کسی نہ کسی طرح شاہ جی کی کوٹھڑی میں پہنچ جاتے تھے اور گھروں سے آئی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں شاہ جی کو دے آتے تھے (قیدی کے رشتہ دار مہینے میں ایک بار صرف چند منٹوں کے لئے قیدی سے مل سکتے ہیں اور گڑ، صابن، پھل، بیڑی اور سگریٹ کی مقررشدہ مقدار اسے دے سکتے ہیں) گھر سے آئی ہوئی یہ اشیاء قیدی کی متاعِ عزیز اور سامانِ عیاشی ہوتی ہیں جسے وہ شاہ جی کی نذر کر رہے تھے۔ میں نے جب شاہ جی کے متعلق معلومات فراہم کیں تو میں حیران رہ گیا کہ جیل کے عملہ کے بھی کئی آدمی ان کے مرید تھے۔

میں نے ایک جیلر سے شاہ جی کا ذکر کیا تو جیلر نے مجھے شاہ جی کے جرم کی تفصیلات سنائیں۔ مختصراً یہ کہ یہ شخص ایک نوجوان لڑکی کو اس کے گھر دینیات پڑھانے جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے اس لڑکی کی جبراً آبروریزی کر ڈالی۔ لڑکی کا جواں سال بھائی موقع پر پہنچ گیا۔ شاہ جی نے چاقو کے چند وار کر کے اُسے قتل کر دیا۔ اور اب چند روز بعد پھانسی چڑھ رہے تھے۔

جب شاہ جی کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا تھا (قطب کا درجہ حاصل کرنے کے لیے) تو راستہ میں ان کا دل ڈوب گیا اور ڈیوٹی وارڈر نے اسے بتایا کہ اسے دو وارڈر سہارا دے کر تختے کی طرف لے گئے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب قاتل پھانسی کے تختے کی طرف جاتے ہیں تو نعرے لگاتے ہوئے یا کلمۂ شہادت یا کوئی آیت پڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔ بیشتر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ لیکن مجسٹریٹوں کو اندھا کرنے والے شاہ جی کو اندھوں کی طرح ہاتھ تھام کر بلکہ گھسیٹ کر سولی پر لے جایا اور چڑھایا گیا۔

تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی تو مر گئے لیکن ان کے معتقد اور کرامات ابھی تک زندہ ہیں۔ لوگ ان کرامات اور روایات کو زندہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ روایات کی موت روایات کو ماننے والوں کی انانیت کی موت ہوتی ہے۔ جب ان سے روایات چھین لی جاتی ہیں تو ان کی حالت اس آدمی کی سی ہو جاتی ہے جو سیلاب میں ہوا سے بھرے ہوئے مشکیزے پر تیر رہا ہو اور مشکیزے میں سوراخ ہو جائے جیل میں جس شدت اور یقین سے درود وظیفے کئے جاتے ہیں ان سے کہیں زیادہ عملی دلائل ان وظائف کے اثرات کی تردید کے لئے خود جیل میں موجود ہوتے ہیں۔ قیدی ہر روز دیکھتے ہیں کہ آج جو قیدی پھانسی چڑھ گیا ہے کونسا ورد اور وظیفہ ہے جو اس نے نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ بچ نہ سکا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ورد وظیفے بدستور جاری رہتے ہیں۔ بات یہ ہے انسان انتہائی نا اُمیدی میں بھی اپنے لئے اُمیدوں کے سہارے تراشتا رہتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرے تو ایک دن بھی نہ جی سکے۔ ان موہوم سہاروں کی پُرفریب افادیت جیل کے اندر جا کر معلوم ہوسکتی ہے۔ باہر کی دنیا والے اسے سمجھ نہیں سکتے۔ مجبور اور بے بس قیدیوں کا یہی نازک پہلو ہے جس سے پیر جی اور ملا فائدہ اُٹھاتا ہے اور نت نئے

دن ایک نیا وظیفہ اور ورد اور اس کے اثرات فضا میں پھیلا دیتا ہے اس کے لئے کچھ لوگ اس کے ایجنٹ کی حیثیت سے بھی کام کرتے ہیں۔ لیکن اصل ایجنٹ خود انسان کی بے بسی ہوتی ہے جو اسے اتنا بھی سمجھنے نہیں دیتی کہ مولوی صاحب کے وظیفہ میں ایسا ہی اثر ہے تو وہ خود جیل کے اندر کیوں سڑ رہے ہیں؟ لیکن جذبات کی شدت ان منطقی دلیلوں کی طرف آنے کب دیتی ہے۔ جیل خانہ میں کسی کی منطق کچھ کام نہیں دیتی۔ اور پیر اور ملا اسی سے فائدہ اٹھا کر جیل کے اندر بھی دکانداری کرتا ہے۔

قیدی کو جب رشتہ دار ملنے آتے ہیں تو اسے کوئی نہ کوئی نیا ٹوٹا ٹوٹکا، ورد یا وظیفہ بتا جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا جاتے ہیں کہ یہ فلاں پیر یا مولوی نے بتایا ہے اور وظیفہ پڑھنے کی اجازت بھی دی ہے۔

''قرآن کی بعض آیات کا ورد ایسا ہے جس کی اجازت کسی نہ کسی پیر سے یا مولوی سے لینا ضروری ہے ورنہ ورد بے اثر، آیۃ کریمہ اور سورہ یٰسین کی ایک آیت: سَلٰمٌ ۣ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (36:58) پڑھنے کے لئے اجازت کی شدید ضرورت ہے۔'' ورنہ خدا کا کلام بے اثر جائے گا۔

جیل میں خصوصاً پھانسی کی کوٹھڑیوں میں، ہر لمحہ ''عبادت'' ہوتی ہے۔ بلا مبالغہ ہر لمحہ۔ بعض قیدی کام کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک جاگیردار قید تھا جسے ''بی کلاس'' دی گئی تھی۔ وہ اَن پڑھ تھا اور ایک وظیفہ کر رہا تھا تسبیح ہر وقت ہاتھ میں رہتی تھی چلتے پھرتے بیٹھے اٹھتے، ہنستے کھیلتے تسبیح اس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ ہونٹ دانے متحرک رہتے تھے اس نے ایک نوٹ بک رکھی ہوئی تھی جس میں وہ تسبیحوں کا حساب لکیروں کی زبان میں لکھا کرتا تھا جس طرح اَن پڑھ بیوی دیوار پر لکیریں ڈال کر دودھ اور دھوبی کا حساب رکھتی ہے۔ وہ تسبیح کے دوران باتیں بھی کرتا تھا۔ باتوں کے دوران اِکی دکی فحش گالی بھی بک جاتا تھا اور اسی میں تسبیح کے چھ سات دانے بھگت جاتے تھے جنہیں وہ نوٹ بک میں لکیر ڈال کر ''خدا'' کے حساب میں درج کر لیتا تھا۔

میں زنداں کی عبادت کا ذکر کر رہا تھا۔ اس عبادت میں نماز کم اور وظیفے ورد زیادہ ہوتے ہیں بعض وظیفے ایسے ہوتے ہیں جن کے دوران گوشت اور نمک کھانا سخت منع ہے۔ ''ورنہ اثر الٹا ہوتا ہے۔'' میں نے ایسے قیدی (خصوصاً سزائے موت والے) دیکھے ہیں جنہوں نے مسلسل آٹھ آٹھ روز روٹی نہیں کھائی صرف پانی پر زندہ رہے ہیں۔ کیونکہ جیل میں سب کے لئے اکٹھا کھانا پکتا ہے جس میں نمک ڈالا جاتا ہے۔ بعض قیدی ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر رات رات بھر عبادت کرتے ہیں۔ ایسے وظیفے بھی ہیں جن کے دوران بولنا سخت منع ہے۔ اگر جیل میں کوئی قیدی اشاروں میں ''باتیں'' کرے تو اُسے گونگا بہرہ نہ سمجھئے۔

قرآن کا ایک استعمال اور بھی ہے ___ فالنامہ نکالنا ___ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ مستند طریقہ یہ ہے کہ کسی جمعرات (چاند کی پہلی جمعرات زیادہ موزوں ہے) صبح سویرے وضو کر کے ایک دعا (جو قرآن کے بعض نسخوں میں لکھی ہوئی ہے) پڑھئے۔ اور قرآن کھولئے۔ جس جگہ سے قرآن کھلے اس کے دائیں صفحے کی پہلی سطر لکھ لیجئے۔ اس سے آگے تیسرے صفحے کی تیسری سطر لکھ لیجئے اور اس سے آگے ساتویں صفحے کی ساتویں سطر لکھ لیجئے۔ یہ ساری تحریر آپ کی لوح تقدیر کی تصدیق شدہ نقل

ہوگی۔ (تقریباً ہر مسجد کا مولوی فال نکالا کرتا ہے)

''بابو صاحب! قرآن کا لکھا تو کبھی ٹل نہیں سکتا۔'' ایک قیدی نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں ایک بات واضح کردوں کہ یہ حالت صرف جاہل اور اَن پڑھ قیدیوں کی نہیں۔ میں نے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس روگ میں مبتلا دیکھا ہے۔ بلکہ ایک عظیم سیاستدان کو بھی میں اسی چکر میں الجھا ہوا پایا___ بہت بڑا سیاست دان بہت بڑا لیڈر___ میں نے اس کے پاس قرآن کا وہ نسخہ دیکھا جس کا ترجمہ انگریزی میں ہے اور جو آج کل نایاب ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ دوسرے ہی روز قرآن سے فال نکال رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ان گنوار اخلاقی قیدیوں سے ورد وظیفے پوچھ رہا تھا جو ابھی کل تک اس کی ''رعایا'' تھے۔ ایک روز میں اس شخصیت کے ساتھ بحث میں الجھ گیا تو لا کے اس گریجویٹ نے تمام عقلی دلائل کو ایک طرف کرکے قرآن کی کرامات اور معجزوں کی ایک طویل فہرست بنا کر مجھے خاموش کردیا۔ خاموشی سے بہتر میرے پاس اور کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ اُس نے مجھے ''عملی دلائل'' دے کر قائل کرنے کی کوشش کی کہ مصیبت کے وقت قرآن صحیح فال بتاتا ہے۔ حتیٰ کہ میں بھی اس کی باتوں میں آ گیا (اُف! بے بسی انسان سے کیا کچھ کرا دیتی ہے!) اور ایک جمعرات قاعدہ کے مطابق اپنی فال نکالی قرآن کی وہ تین سطریں (جو صفحہ نکلا اس کی پہلی سطر، تیسرے صفحہ کی تیسری اور ساتویں صفحے کی ساتویں سطر) ان کا ترجمہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں۔ سو ان کے ساتھ نکاح کرو اُن لوگوں کے اذن سے اور دو ان کے مہر۔ آگ میں اور یہ اللہ پر آسان ہے۔ اگر تم بچے رہو گے۔

میں نے تو اپنی رٹ پٹیشن (Writ Petition) کی کامیابی یا ناکامی کا حال پوچھا تھا۔ لیکن قرآن کی فال نے جو کچھ مجھے بتایا وہ آپ خود ہی پڑھ لیجئے۔

اس وقت تک میں جیل میں ایک سال پورا کر چکا تھا۔ ابھی چھ سال باقی تھے___ چھ لمبے سال___ میں نے ہائیکورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کر رکھی تھی جس کی سماعت جاری تھی۔ کسی فضا اور ماحول میں (خواہ وہ خوشگوار ہو یا تکلیف دہ) جذب ہوجانے کے لئے ایک سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔ میں لاشعوری طور پر جیل کے اثرات قبول کرتا جا رہا تھا۔ یوں کہنا چاہئے کہ میری (Brain Washing) مکمل ہوتی جا رہی تھی۔ سات برس کا مہیب عرصہ میری بے بس ہستی پر آتش فشاں پہاڑ کی طرح جھکا رہتا تھا۔ جس میں سے سیاہ کالا دھواں نکلتا رہتا تھا۔ یہ بے بسی اپنی جگہ تھی اور گردوپیش میں ہر طرف ''تسبیحاں''، آیات کا ورد، وظیفے، کرامات، معجزے، تعویذ اور روایات تھیں۔ کیا اَن پڑھ، کیا لکھے پڑھے اور کیا گریجویٹ سب کی زبان پر ''فلاں وظیفے کا فلاں معجزہ'' اور ''فلاں آیت کی فلاں کرامات'' اور ان کے ''زندہ ثبوت'' کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ ایک طوفان تھا جو ہر روز چاروں طرف سے اُمنڈ کر مجھے گھیرے رہتا تھا۔ بالآخر___ دل ہی تو تھا نہ سنگ وخشت میں نے محسوس کیا کہ میرے پاؤں تلے سے بھی زمین نکلی جا رہی ہے۔ میں اس سے پہلے اپنے عقیدے کی شکست برداشت کرنے

کے لئے کبھی تیار نہیں ہوا تھا۔ معارف القرآن کی دو جلدیں، معراجِ انسانیت، سلیم کے نام خطوط اور ''طلوعِ اسلام'' کے تازہ پرچے میرے پاس موجود تھے۔ میں نے ان مطبوعات کے ایک ایک لفظ کو اس طرح مضبوطی سے تھامے رکھا جس طرح کوئی سیلاب میں بہتا ہوا کسی جھاڑی کو پکڑ لیتا ہے۔ لیکن سیلاب کا زور بڑھ رہا تھا۔ جھاڑی ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی۔ میں نے پھر بھی شکست کو تسلیم نہ کیا۔ مگر تسلیم نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں خود ایک وظیفہ شروع کر چکا تھا۔ ہر رات چار گھنٹے لگاتار بارہ ہزار مرتبہ ''یا حی و یا قیوم'' کا ورد، باوضو سونا اور خواب کو غور سے دیکھنا، کیونکہ بتانے والے نے بتایا تھا کہ خواب میں اشارہ ملے گا۔

یہ وظیفہ مجھے جیل کے اسٹاف کے ایک بزرگ ملازم نے بتایا تھا جو خود اس وظیفے سے ''فائدہ'' اٹھا چکا تھا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ مسلسل چار گھنٹے باوضو بیٹھنا کس قدر اذیت ناک کام ہے۔ جبکہ انہی دنوں مجھے Gastric کی تکلیف تھی۔ لیکن میں نے یہ اذیت ناک کام کیا اور چالیس روز کیا۔ اس وظیفے کے جو پرہیز ہیں میں ان کی تفصیلات میں جانے سے گریز کروں گا۔

وظیفہ شروع کرنے سے پہلے رٹ پٹیشن کی سماعت میرے حق میں ہو رہی تھی جب وظیفہ نصف کو پہنچا تو ایک روز گھر والوں نے مجھے اطلاع دی کہ ججوں کا رویہ خلاف توقع بدل گیا ہے۔ شاید رٹ ناکام ہو جائے۔ میں نے وظیفہ بتانے والے بزرگ کو بتایا تو وہ بڑے وثوق سے بولے کہ تم وظیفہ جاری رکھو۔ چنانچہ میں نے وظیفہ باقاعدگی سے پرہیزوں کے ساتھ جاری رکھتے ہوئے جونہی ختم کیا تو اطلاع ملی کہ ہائیکورٹ نے میری رٹ پٹیشن مسترد کرتے ہوئے سات سال کی سزا بحال رکھی ہے۔ میں نے اپنے پیر استاد کو بتایا تو انہوں نے ایک اور وظیفہ بتایا اور پڑھنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس دوران میں مجھے ایک اور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں میں نے دوسرا وظیفہ شروع کر دیا۔ گھر سے اطلاع آئی کہ میری بیوی نے میرے کیس کی ریویژن پٹیشن دائر کر دی ہے۔ میں نے وظیفے میں اور جان ڈال دی۔ لیکن گھر سے آنے والی اطلاعیں بڑی ہی مایوس کن تھیں۔

میرے اپنے ہی سینے میں ایک چنگاری سی سلگی۔ یہ قدرت یا ''تقدیر'' کے خلاف احتجاج تھا یا جانے کیا تھا۔ مجھے اسی قدر یاد ہے کہ میں نے غصے میں آ کر وظیفہ نصف میں ہی ترک کر دیا۔ لیکن وظیفے کے متعلق میری رائے دو حصوں میں بٹ گئی۔ میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وظیفے کو از سرِ نو شروع کروں یا نہ کروں۔ بہرحال میں نے وظیفہ جاری نہ رکھا لیکن میں اس کے الٹے اثر سے ڈرتا ضرور رہا۔ استاد نے تاکیداً کہا تھا کہ وظیفہ ادھورا نہ چھوڑنا ورنہ پچھتاؤ گے۔ وظیفہ ادھورا چھوڑ دینے کے چند ہی روز بعد اطلاع آئی کہ صدرِ پاکستان نے میری میعادِ قید کے دو سال کم کر دیئے ہیں۔ میں نے اپنی ذات کے دونوں حصوں کو یکجا کر لیا اور میں نے ایک بار پھر اپنے اصلی روپ میں آ کر فیصلہ کر لیا کہ یہ وظیفے اور آیات کا ورد، خدا اور قرآن کے ساتھ مذاق اور خود فریبی ہے اور حقائق سے فرار کا ''مقدس طریقہ'' جب میں نے یہ بوجھ اتار پھینکا تو ایک دن کراچی سے سرکاری تار آیا ___ ''عنایت کو فوراً رہا کر دیا جائے۔'' ___ میعادِ قید کا ابھی بمشکل چوتھا حصہ ہی گزرا تھا کہ مجھے رہا کر دیا گیا۔ اس موقعہ پر مجھے چین کے ایک ڈاکٹر اور مریضہ کا قصہ یاد آ گیا۔ ایک بار ایک غیر ملکی نے چین کے کسی

شہر میں ایک چینی سے پوچھا کہ یہاں کا قابلِ ترین ڈاکٹر کون ہے؟ چینی نے جواب دیا ــــــ ''چونن ٹانگ قابل ترین ڈاکٹر ہے۔ اس نے ایک بار مجھے موت کے منہ سے زندہ نکال لیا تھا'' ــــــ پوچھا۔ ''وہ کیسے؟'' چینی نے سنایا ــــــ ''ایک بار مجھے بخار ہو گیا تو میری بیوی نے ایک ڈاکٹر کو بلایا جس کی دوائی سے بخار اور تیز ہو گیا۔ دوسرے دن میری بیوی نے ایک اور ڈاکٹر کو بلایا تو اس کی دوائی سے بخار اور تیز ہو گیا اور میں مرنے کے قریب جا پہنچا۔ آخر میری بیوی نے ڈاکٹر چونن ٹانگ کو بلا بھیجا مگر وہ نہ آیا اور میں بچ گیا۔''

میں آج سوچتا ہوں کہ اگر میری رہائی کا تار کہیں وظیفہ کے دوران آجاتا تو پرویز صاحب کے ہزار قرآنی دلائل کے باوجود میں کس طرح یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کرتا کہ حضرت! ان وظائف کا اثر میں نے اپنے آپ پر دیکھ لیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ نظری دلائل کیا وزن رکھتے ہیں۔ ایک اتفاقی حادثہ انسان کی زندگی کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے!

پرویز صاحب کی آخری اپیل

آخر میں، میں اپنی اُس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دہراؤں گا، جسے میں ہر سال آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ:

1۔ اپنے ذہن میں کسی غیر قُرآنی تصور و خیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

2۔ اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرو کہ قُرآن کی تعلیم انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتی ہے۔

3۔ قُرآنی فکری نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو۔ لیکن جو کچھ کرو خالصۃً بوجہ اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

4۔ آپ سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ پرستی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے قطعاً نہ الجھنے دو۔

5۔ اپنے وقت اور توانائی کو، ضدی طبقے کے ساتھ بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرو۔ قُرآنی تعلیم کو صرف اُن لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم و بصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

6۔ ہر رات سونے سے پہلے یہ سوچو کہ آپ نے۔

(i) دن بھر میں قُرآنی احکام و تعلیم کے خلاف تو کوئی کام نہیں کیا۔ اور

(ii) آپ نے کسی دُکھی انسان کو سکھ پہنچانے کے لئے کیا کیا ہے۔ یاد رکھئے! انسانیت کی بے لوث خدمت، بلند ترین مقصد زندگی ہے۔

7۔ اور آپس میں محبت اور پیار اور مُودّت و الفت کے ساتھ رہو، کہ دنیا میں قُرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

پرویزؔ

اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے اور آپ کے عزائم کو کامیابی عطا فرمائے۔ (والسلام!) (''منزل بہ منزل''، صفحہ: 181)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ریاستِ مدینہ

تحریکِ طلوعِ اسلام کی اساس قرآنِ خالص پر مبنی ہے۔ یہ تحریک کفایت قرآن کی قائل ہے (29:51) اور اقامتِ دین کی داعی ہے (42:13) اس وقت ساری دنیا میں یہ واحد تحریک ہے جو اقامتِ دین کی داعی ہے۔ مصر کی مشہور جماعت اخوان المسلمین اور پاکستان کی جماعت اسلامی، اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی تنظیم اسلامی اقامتِ دین کا دعویٰ کرتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک جماعت بھی اقامتِ دین کی حقیقت سے واقف نہیں ہے۔ ہم اپنے اس دعویٰ کی وضاحت آگے چل کر اسی مضمون میں کریں گے تحریکِ طلوعِ اسلام کا نہ کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق ہے، اور نہ کسی مذہبی فرقہ سے کوئی علاقہ۔ یہ تحریک فرقہ بندی کو حرام قرار دیتی ہے اور اس کی بنیاد شرک پر قرار دیتی ہے۔ اس کے نزدیک قرآن کی رُو سے انسانوں کو بنیادی اصولوں سے متعلق قانون سازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ قانون ساز صرف ذاتِ حضرت باری تعالیٰ ہے۔ باقی سب بتان آزری۔ اس تحریک کے نزدیک قرآن کی رو سے ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی جدوجہد کرے (42:13) جو شخص غیر اسلامی نظام میں بخوشی زندگی بسر کرتا ہے وہ مجرم ہے اور ان کے لیڈر اکابر مجرمین، مجرموں کے سردار ہیں (6:123)، اور غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنیوالوں کا ٹھکانہ جہنم ہے (4:97)۔

اس تحریک کے آرگن رسالہ طلوعِ اسلام میں شخصیات کے متعلق کچھ تحریر کرنے سے اجتناب ہی کیا جاتا ہے۔ البتہ اس مضمون میں جناب عمران خاں کا حوالہ دیا جانا ناگزیر ہو گیا ہے کیونکہ انہوں نے وزیراعظم ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی ہے اس میں انہوں نے نہ صرف ریاست مدینہ کا ذکر کیا ہے بلکہ اس کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کی خوبیوں کا اس دور کی بہترین ریاستوں سے موازنہ بھی کیا ہے اور ایسی ریاست قائم کرنے کا عزم بھی ظاہر کیا ہے۔

ریاست مدینہ کی انسانی تاریخ میں جو اہمیت ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس ریاست نے انسانیت کا ایک نیا دور شروع کیا تھا اور انسانیت کو ایک نئے دور میں داخل کیا تھا۔ اس سے پیشتر انسان کسی بھی نظام سے واقف نہیں تھا۔ قبائلی سسٹم اور ملوکیت کا نظام ازخود قوت کے زور پر Evolve ہوتا چلا گیا تھا۔ آج تک دنیا میں جتنی ریاستیں قائم ہوئیں ہیں ان میں سے کسی ایک ریاست کی بھی کوئی اساس نہیں تھی اور نہ اس دور میں ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ایکہ می خواہی نظام عالمے جستہ ای او را اساسِ محکمے

یعنی تم جو انسانیت کے لئے ایک نظام تلاش کر رہے ہو تو کیا تم نے اس نظام کی کوئی بنیاد تلاش کر لی ہے۔ مارکس نے کمیونزم کا ایک پورا مکمل نظام تشکیل دے لیا تھا اور یہ نظام دوسرے نظاموں سے قدرے بہتر بھی تھا۔ لیکن مارکس کو کوشش بسیار کے باوجود اس نظام کی کوئی بنیاد نہیں مل سکی جس کا اس نے اعتراف بھی کیا۔ اسی وجہ سے وہ نظام فیل اور ناکامیاب بھی ہو گیا۔ صرف اور صرف اسلامی نظام اپنے قیام کے لئے ایک مضبوط اساس فراہم کرتا ہے۔ جس کی صرف تحریک طلوعِ اسلام داعی ہے اور یہی اس تحریک کا بہت بڑا امتیاز اور شرف ہے خلافت راشدہ کے انقراض کے بعد ریاست مدینہ جیسی ریاست دوبارہ قائم نہیں ہو سکی اور نہ ہی اس کی اقامت کی کہیں جدوجہد کی گئی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہماری پیشوائیت اقامت دین کے خلاف ہے۔ ہماری پیشوائیت کے نظریات ہی وہ ہیں جن کی وجہ سے اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ ہم اس کی وضاحت آگے پیش خدمت عالی کرتے ہیں۔

محترم عمران خاں صاحب نے ریاست مدینہ کا جو ذکر کیا ہے۔ ہماری خوش فہمی یہی ہے کہ یہ کوئی سیاسی حربہ نہیں ہے، اور نہ ہی یہ کوئی Catch---Word ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ دل سے اس بات کے متمنی اور آرزومند ہیں کہ پاکستان ریاست مدینہ جیسی لاجواب ریاست بن جائے۔

محترم عمران خان صاحب نے مدینے کی ریاست کی جو خوبیاں بیان کی ہیں ان سب خوبیوں کا انہوں نے اس دور کی مغربی ریاستوں کے ساتھ موازنہ کیا کہ جو خوبیاں آج مغربی ممالک میں پائی جاتی ہیں وہ سب خوبیاں ریاست مدینہ میں موجود تھیں۔ ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو اصل خوبی اور جو اسلامی ریاست کا مابہ الامتیاز خاصہ ہے وہ ان کے سامنے نہیں آیا۔ انہوں نے ریاست مدینہ کو اپنا مطمحِ نگاہ بنایا ہے انہوں نے خود بھی اسلامی نظام یا اقامت دین کا نام نہیں لیا۔ کچھ عرصہ پیشتر انہوں نے ایک T.V چینل پر یہ بیان دیا تھا کہ وہ گذشتہ 30 سال سے معرفت کے سفر پر گامزن ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انہیں اقامت دین کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ انہیں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ قرآن کریم میں معرفت خداوندی حاصل کرنے کا کوئی حکم نہیں ہے۔ قرآن کریم میں تو معرفت کا لفظ تک نہیں آیا۔ معرفت کا راستہ ہی تو اقامت دین میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چند سال پیشتر گذشتہ صدی کے آخری حصہ میں ایران میں اسلامی نظام قائم کرنے کی سرتوڑ کوششیں کی گئیں۔ وہاں کی عوام نے بڑی قربانیاں پیش کیں۔ ہزاروں ہزار کی تعداد میں لوگ مارے گئے۔ خود اس انقلاب کے لیڈر امام خمینی بہت قدآور شخصیت تھے۔ لیکن وہ نظام قائم نہیں ہو سکا۔ اس میں وہاں کی عوام کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کے لیڈروں اور ان کے علماء کے سامنے دین کا صحیح تصور نہیں تھا۔ وہ اقامت دین اور معرفت کے سفر میں امتیاز نہیں کر سکے اس لئے وہ انقلاب ناکام ہوا۔ اور اسلام بھی بدنام ہوا۔ ورنہ اسلامی نظام کی تو یہ شان ہے کہ: يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2) اسلامی نظام میں تو لوگ فوج در فوج داخل ہوتے ہیں اس کے تو صرف قائم ہونے کی دیر ہوتی ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ قرآنِ کریم جو نظام پیش کرتا ہے اُسے وہ دین کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ ارشادِ عالی ہے اِنَّ

الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ (3:13) اللہ کے نزدیک تو ضابطۂ حیات الاسلام ہے۔ نیز ارشادِ عالی ہے: وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۚ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (3:85) جو فرد یا قوم اسلامی نظام کے علاوہ زندگی کے لئے کوئی دوسرا نظام اختیار کرے گی تو میزانِ خداوندی میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا اس نظام سے اس قوم کو مفاد عاجلہ تو حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن مستقبل میں وہ سخت نقصان میں رہے گی۔ قرآنِ کریم نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ جس آئیڈیالوجی پر بھی عمل کیا جائے، پوری پوری آئیڈیالوجی پر عمل کیا جائے۔ یہ نہ کیا جائے کہ آئیڈیالوجی کے بعض حصہ پر تو عمل کیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے اس کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی ہوتا ہے (2:85) فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ۔ (2:208) اے ایمان لانے والو اسلام کے نظام میں پورے کے پورے داخل ہو۔ اس لئے یا اسلامی نظام پر عمل کیا جا سکتا ہے یا جمہوریت پر، جمہوریت اور اسلامی نظام دونوں کو ملا کر عمل نہیں کیا جا سکتا اس کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی ہوگا (2:85)

اس تمہید کے بعد اب ہم اقامت دین کا موضوع شروع کرتے ہیں۔

زندگی (The Life) اس کائنات کے وجود میں آنے سے پیشتر موجود تھی۔ لیکن اس وقت اس کا کوئی پیکر نہیں تھا لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (76:1) ترجمہ: وہ کوئی چیز نہیں تھا کہ زبان پر آئے۔ جب زندگی نے ایک پیکر اوڑھ لیا (اختیار کر لیا) تو قرآن نے اس کو زندگی تسلیم کر لیا۔ زندگی کیسے وجود میں آ گئی اس کے متعلق نہ تو سائنس ایک لفظ کہتی ہے اور نہ ہی قرآن کریم نے اس کے متعلق کوئی علم دیا ہے۔ البتہ زندگی نے جو Stages طے کی ہیں ان کی تفصیل سائنس بھی بتاتی ہے اور قرآن کریم نے بھی بہت کھل کے ان مراحل کا تذکرہ قرآن میں متعدد مقامات پر بار بار کیا ہے۔ زندگی ہزاروں، لاکھوں سالوں میں آہستہ آہستہ، منزل بہ منزل مرحلہ بہ مرحلہ، ترقی کرتے ہوئے حیوانیت کی سطح پر پہنچی ہے جب زندگی حیوانیت کی سطح سے آگے بڑھی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی ایک صلاحیت عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے موسوم کیا ہے۔ یہ صلاحیت جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو روح کہتا ہے اور جب یہ توانائی نوع انسانیت کو ملتی ہے تو قرآن اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع، بطور ایک کُل کے ملتی ہے تو یہ نفس کے لفظ سے پکاری جاتی ہے اور یہ خدا کی عطا کردہ صلاحیت ہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا قائل ہے مگر وہ روح انسانی کا منکر ہے۔ نزول قرآن کے وقت، اور آج بھی ساری دنیا روح انسانی کی قائل ہے لیکن اس بات سے قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے روح انسانی کا انکار کر کے، نفس کا تصور پیش کیا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو یہ چند اینچ کے جسم اور نفس پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہمارے علماء کرام کا یہ تسامح ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کے اس نکتہ کو گرفت نہیں کیا اور جس کی وجہ سے مسلمان ایک غلط راہ پر پڑ گئے۔

قرآن کریم میں روح کا لفظ بیس (20) مقامات پر آیا ہے۔ ہمارے علماء نے روحانیت کے تزکیہ پر بہت اصرار کیا ہے۔ قرآن کریم چونکہ روح انسانی کا قائل ہی نہیں اس لئے اس نے روح انسانی کے تزکیہ کے اصول بھی نہیں بتائے۔ اس لئے روحانیت کا لفظ بھی قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ ہماری پیشوائیت نے روح کے تزکیہ کے اصول خود ہی وضع کئے ہیں۔ انہوں نے روحانیت کے حصول کے جو اصول وضع کئے ہیں، اس میں نظام درمیان میں آتا ہی نہیں۔ انہوں نے روحانیت کے حصول کے لئے پرستش کو اس کا ذریعہ بنایا ہے، پرستش، پہاڑوں، جنگلوں، زاویوں، کونوں میں ہر جگہ ہوسکتی ہے عیسائیت میں چونکہ ہر بچہ گنہگار پیدا ہوتا ہے اس لئے ان کے ہاں روح کے پاک کرنے کا عقیدہ پیدا ہوا، روح کو پاک کرنے، اور نفس کشی کا عقیدہ مسلمانوں نے وہاں سے لیا۔ ہمارے روحانین، صوفیائے کرام نے روح کی پاکیزگی کے جو اصول بھی بنائے وہ قوم کو زوال پذیر اور برباد ہی کر دیتے ہیں۔ روحانین اس کائنات کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ وہ اس کائنات کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے۔ وہ علم حاصل کرنے کے خلاف ہیں۔ قرآن نے سماعت، بصارت اور فؤاد کو علم حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے (17:26) یہ حضرات علم کے حصول کے لئے ان میں سے کسی ایک کو بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ حضرات باطنی ذرائع سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کو علم سند کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد روحانیت میں ترقی کرنا ہوتا ہے، جو پرستش کے ذریعے پورا ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے انہیں اسلامی نظام کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا سارا دارومدار اور اصرار روح کی ترقی پر ہوتا ہے۔ ان کا نفس انسانی سے دور دور تک کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ اقامت دین کے قائل بھی نہیں اور اسی وجہ سے گذشتہ 14 سو سال سے کہیں بھی اسلامی نظام قائم نہیں ہوسکا۔

اس کے بالکل برخلاف نفسِ انسانی ہوتی ہے۔ اسی سے انسان صاحبِ اختیار و صاحبِ ارادہ ہوتا ہے۔ اور اپنے ہر عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ اس کو نشوونما دینا ہر انسان کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ اس کی نشوونما کے متعلق ارشادِ عالی ہے: اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا (4:49) ترجمہ: اے رسولؐ) کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی جو آپ بڑے مقدس بنتے ہیں خدا جس کو چاہتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے اور ظلم تو کسی پر تاگے کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ انسانی ذات کی نشوونما قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ہوتی ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں انسان وحیِ الٰہی کا محتاج ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ نہ تو نفس انسانی کا کہیں تصور پایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی نشوونما کے اصول کہیں پائے جاتے ہیں۔ نفسِ انسانی کی تربیت مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی عطا کردہ یہ مستقل اقدار جس قدر نفس انسانی کا تزکیہ کرتی ہیں اسی قدر وہ معاشرہ کا بھی تزکیہ کرتی چلی جاتی ہیں۔

ہم اس کی ایک دو ہی مثالیں عرض کرتے ہیں کیونکہ یہ مثالیں بڑی تعداد میں ہم دوسرے مضامین میں تحریر کر چکے ہیں۔

قرآن کریم کی اقدار میں سے ایک نمایاں قدر عدل ہے تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے ایک جیسا شمار کرنا عدل ہے ہر شخص کی صلاحیتوں کی یکساں نشوونما کرنا عدل ہے۔ جب کوئی شخص عدل کرتا ہے تو اس کے نفس میں نشوونما ہوتی ہے۔

لیکن کسی معاشرہ میں عدل کا عام رواج ہونا معاشرہ کو بھی درست کرتا ہے۔ اسلامی مملکت کا شہری اپنی نفس کی نشوونما کے لئے عدل کرتا ہے۔ لیکن اس کا By-Product یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ خود بخود بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اسلامی مملکت میں دوسروں کی پرورش کرنے سے اپنی پرورش ہوتی چلتی ہے۔ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰیۚ (92:18) ترجمہ: جو شخص اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے۔ اس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی ذات کی پرورش کے لئے دوسروں پر اپنا مال خرچ کرے گا، لیکن اس سے معاشرہ کے غریب لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ اور اس معاشرہ سے افلاس دور ہوجائے گا۔

انسانی زندگی کا مقصد ذات کی نشوونما کرنا ہے۔ قرآن وہ نظامِ حیات عنایت فرماتا ہے۔ جس کے مطابق انسانی ذات اور انسانی جسم دونوں کی بیک وقت پرورش ہوتی چلتی ہے جس کام سے انسانی ذات اور معاشرہ کا تزکیہ ہوتا ہے وہ عمل خیر ہے اور جن کاموں سے انسانی ذات کی نشوونما رُک جائے اور معاشرہ کی اصلاح نہ ہو وہ عمل شر ہے۔ ذاتِ انسانی اور معاشرہ کی اصلاح اور فساد کی اقدار ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اچھی یا بُری مملکت اور انسانی ذات کا معیار ایک ہی ہے۔ جس مملکت میں افراد کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے وہ حق ہے اور اسلامی نظام ہے۔ جس نظام میں انسانی ذات کی نشوونما رک جائے وہ باطل ہے اور طاغوتی نظام ہے۔ اسلامی مملکت اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ اس میں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور اس میں اس کے ہر شہری کی خوابیدہ قوتیں وصلاحیتیں اپنی پوری توانائیوں کو پہنچ جاتی ہیں۔

(1) جو لوگ انسانی ذات کے قائل نہیں اور سیکولر کہلائے جاتے ہیں ان کو اسلامی نظام قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے خیال میں انسان صرف طبعی جسم پر مشتمل ہے وہ طبعی قوانین کے مطابق وجود میں آتا ہے اور ان ہی قوانین کے مطابق سرگرم عمل رہتا ہے اور ان ہی طبعی قوانین کے مطابق ختم ہوجاتا ہے اور انسانی جسم کے ختم ہونے کے بعد انسانی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس تصورِ حیات کی رُو سے نہ خدا کو ماننے کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ کسی خارجی ہدایت کی ضرورت۔ جسم کی پرورش طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے جہاں تک اجتماعی زندگی کا تعلق ہے۔ اس کے لیے یہ حضرات عقل اور تجربہ ومشاہدہ سے کام لے کر ایسے قوانین مرتب کر لیتے ہیں جس سے معاشرہ میں تنظیم پیدا ہوجاتی ہے وہ معاشرہ میں بہتر سے بہتر اصلاح کرتے چلتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو کفر، ظلم اور فسق پر مبنی قرار دیتا ہے (5:45، 5:44، 3:47) قرآن کریم ان کو سند ہی نہیں کرتا۔ کیونکہ انسانی قوانین کی تشکیل میں صرف قومی مفاد پیش نظر ہوتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ نفس انسانی کے قائل نہیں ہیں اس لئے قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح کی زندگی قرار دیتا ہے وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) ترجمہ: جو لوگ (وحی خداوندی) کا انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح متاعِ حیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُۚ (45:24) ترجمہ: کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم طبعی قوانین کے مطابق مرتے اور

زندہ رہتے ہیں اور مرورِ زمانہ ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔

اس مکتب فکر کے برخلاف اور اس کے برعکس ایک دوسرا مکتب فکر ہے جو اللہ رسول، وحی، آخرت، سب چیزوں کا قائل ہے، لیکن یہ مکتب فکر انسانی ذات کا قائل نہیں ہے۔ چونکہ انسانی ذات کی پرورش اسلامی نظام میں ہوتی ہے جس کا یہ منکر ہے اس لئے اس کو اسلامی نظام کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گروہ روحِ انسانی اور روحانیت کا قائل ہے اور روح اور روحانیت کی پرورش چونکہ پرستش سے ہوتی ہے اور پرستش کسی بھی جگہ کی جاسکتی ہے اس لئے انہیں اسلامی مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ گروہ کائنات کے وجود کا قائل نہیں ہے کائنات کے متعلق منفی انداز نگاہ تصوّف کی اساس ہوتا ہے۔

مصر کی مشہور جماعت اخوان المسلمین اور پاکستان کی جماعت اسلامی اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی تنظیم اسلامی یہ تینوں جماعتیں اقامتِ دین کی قائل ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تینوں جماعتیں نفس انسانی کی بجائے روح اور روحانیت کی قائل ہیں۔ یہ اطاعت خداوندی کی بجائے پرستش خداوندی کی قائل ہیں۔ ان کا مقصد زندگی پرستش خداوندی سے حاصل ہوجاتا ہے تو انہیں اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت ہی نہیں۔ خوب یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ براہِ راست علم حاصل ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کی براہِ راست اطاعت ہوسکتی ہے جس طرح براہِ راست علم حاصل ہونے کے تصور نے قرآن کو عملاً منسوخ کر دیا ہے اسی طرح براہِ راست اطاعت خداوندی کے تصور نے انسانیت کو اطاعتِ خداوندی سے محروم کر دیا، اور اقامتِ دین کی ضرورت کو بھی ختم کر دیا ہم مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ہماری پیشوائیت براہِ راست علم ملنے اور براہِ راست اطاعت کرنے کی قائل ہے۔ ان ہی دونوں عقیدوں کی وجہ سے اسلامی نظام نہ قائم ہوا نہ آئندہ قائم ہوسکتا ہے۔ اخوان المسلمین اور جماعت اسلامی بھی ان دونوں عقیدوں کی قائل ہے، اس لئے وہ کبھی بھی اقامتِ دین نہیں کرسکیں گی۔ تحریک طلوع اسلام وہ واحد اور منفرد تحریک ہے جس نے ان دونوں عقائد کی تردید کی اور ان کی علمی طور پر تردید کی۔ اسلامی نظام صرف وہ قوم قائم کرسکتی ہے جو ان دونوں عقائد کے خلاف ہو۔ نفس انسانی پر یقین رکھتی ہو۔ روحانیت کی منکر ہو اور اسلامی / قرآنی مملکت کی اطاعت کو عبادت خداوندی گردانتی ہو۔ جب تک آپ پرستش کو ترک کرکے، اسلامی/قرآنی نظام کی اطاعت کو عبادت خداوندی نہیں گردانیں گے، اسلامی نظام قائم نہیں ہوسکے گا، اور نہ ہی مسلمان ذلت وخواری کے عذاب سے باہر نکل سکیں گے۔

نفس انسانی اور اسلامی نظام دونوں لازم وملزوم چیزیں ہیں۔ ایک کو ماننے سے دوسرے کو لازماً ماننا پڑے گا۔ نفس کی تربیت اسلامی نظام کے علاوہ کسی طرح بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ اسلامی نظام میں مستقل اقدار جاری ہوتی ہیں۔ اس کی اساس صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے۔ اسلامی نظام میں ہر طرف صفاتِ خداوندی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اللہ کی محکومیت اختیار کرنے سے یہ مقاصد عالی حاصل ہوتے ہیں، پرستش کرنے سے ان مقاصد میں سے ایک مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب اطاعت خداوندی ترک کر کے پرستش کو اختیار کرنا ہے۔ قرآن نے فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56) ترجمہ: ہم نے جن وانس کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری محکومیت اختیار کریں۔ اس آیۂ کریمہ میں تخلیق انسانی کا مقصد اس درجہ واضح اور دوٹوک طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ اس کا تعین کرنے میں ذرہ برابر ابہام نہیں رہتا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے مفسرین قرآن اور مترجمین حضرات قرآن کا ہی عمداً غلط ترجمہ کر دیں۔ ہمارے علماء نے عبادت کا ترجمہ پرستش کرنا اور بندگی کرنا کیا ہے۔ بندگی کے لفظ کو عمداً Choose کیا گیا ہے کیونکہ بندگی کے ہندی زبان میں پرستش کرنا معنی ہیں۔ اور فارسی زبان میں اس کے معنی اطاعت کرنا ہے۔ عبادت کا ترجمہ بندگی اس وجہ سے کیا گیا تا کہ بات مبہم رہے اور وقت کی مناسبت سے کوئی سا ترجمہ اختیار کر لیا جائے جناب حضرت شیخ الہند نے، جن کا ترجمہ سب سے زیادہ مستند خیال کیا جاتا ہے، اُنہوں نے اس جھجک کو بھی دور کر دیا، اور وہ کھل کے سامنے آ گئے اور انہوں نے عبادت کا ترجمہ محکومی کی بجائے پوجنا کیا ہے (36:66، 39:14، 1739، 43:45، 43:8) اور دیگر بیشمار مقامات، انگریزی زبان میں پکھتال نے اور دیگر انگریزی ترجموں میں عبادت کا ترجمہ Worship کیا گیا ہے یہ ہمارے علماء جنہوں نے عبادت کا ترجمہ پرستش کیا ہے یہ عام لوگ نہیں ہیں، یہ حضرات عربی ادب کے امام ہیں لیکن جب ان سب حضرات نے اپنے نظریات ہی قرآن کے خلاف کر لئے تو اس کا تو کوئی علاج کسی کے پاس نہیں۔

خلافت راشدہ سے لیکر تا ایں سیاہ دوران، تحریکِ طلوعِ اسلام واحد اور منفرد تحریک ہے جس نے عبادت کا ترجمہ محکومیت کیا اور قرآن نے تخلیق انسانی کا جو مقصد بیان کیا اس کو واضح کیا۔

قرآن کریم نے العبد کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال کیا ہے ارشادِ عالی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2:178) ترجمہ: اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں حکم قصاص تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام۔ اس آیۂ کریمہ میں قرآن کریم نے العبد کو الحر کے مقابلہ میں یعنی غلام کو آزاد کے مقابلے میں استعمال کیا ہے۔ غلام اپنے آقا کی اطاعت کرتا ہے۔ کوئی غلام اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا۔ نہ اُسے پوجتا ہے۔ عبادت کا لفظ عبد سے مصدر ہے اس کے معنی محکومی کرنا ہے۔ اس کے معنی میں پرستش کا تصور کبھی نہیں آ سکتا۔

(2) پرستش کا تصور ہی قرآن کے خلاف ہے۔ مذہب میں پرستش ہوتی ہے جبکہ دین میں محکومی ہوتی ہے۔ جب حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارونؑ نے فرعون اور اس کے درباریوں کو ایمان لانے کی دعوت دی تو انہوں نے ان دونوں حضرات کے جواب میں کہا تھا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ (23:47) ترجمہ: کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان دونوں کی قوم ہماری محکوم ہے اس آیت میں عابدون کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

یہ بات خوب واضح رہے کہ بنی اسرائیل فرعون یا اُس کی قوم کی پرستش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ فرعون کی محکوم تھی اس لئے اس آیت میں یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ عبادت کے معنی محکومی کے ہیں۔ پرستش کے ہرگز نہیں ہوسکتے۔

(3) سورۂ شوریٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو ایمان لانے کی دعوت دی اور اس سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دے تو اس نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے وہ احسانات شمار کرنے شروع کردیئے جو اس نے بنی اسرائیل پر کئے تھے، اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے نیم طنزاً اور نیم مزاحاً فرمایا کہ تم نے یہ بھی تو احسان کیا ہے اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (26:22) ترجمہ: کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا ہے۔ یہ لفظ عبدت اسی لفظ عبد سے بنا ہے۔ فرمایا کیا تمہارے یہ احسانات ہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام و محکوم بنالیا ہے۔ اس آیت سے عبادت کا مفہوم محکومی اور واضح ہوگیا ہے۔

(4) سورۂ کہف میں محکومیت اور عبادت مترادف المعانی استعمال ہوئے ہیں۔ اس سورہ میں ایک مقام پر تو ارشاد ہے وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) اللہ تعالیٰ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اسی سورۂ کہف میں ہی آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے وَّلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ (18:110) اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ ان دونوں آیات میں حکمہٖ اور عبادۃ ایک دوسرے کی جگہ Substitute کردیئے گئے ہیں۔

(5) سورۂ نحل میں العبد کی Definition اس سے بھی واضح طور پر بیان کردی گئی ہے جبکہ ارشاد عالیٰ ہے عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ (16:75) ترجمہ: بندہ غلام کسی چیز پر بھی قدرت نہیں رکھتا۔ اس آیت میں قرآنِ کریم نے عبد کی یہ تعریف کی ہے کہ عبد وہ ہوتا ہے، جو خود دوسرے کا مال ہوتا ہے۔ اپنے پر بھی کسی طرح کی قدرت نہیں رکھتا۔ ہر ایک تصرف میں مالک کی اجازت کا محتاج ہوتا ہے۔ مالک کی اجازت کے بغیر سب تصرفات غیر معتبر ہوتے ہیں۔ اس کو تو اپنی جاں تک پر تصرف و اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی غلام اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا صرف اطاعت کرتا ہے۔ اس لئے عبادت کے بنیادی معانی میں پرستش داخل نہیں ہے۔

(6) سورۂ یوسف میں ارشاد عالی ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40)، حکومت اللہ کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہوسکتی، اس کے بعد اسی آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ؕ (12:40)، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو۔ اس ایک ہی آیت میں قرآن نے حکومت اور عبادت کے الفاظ کو ایک ہی معنی ہیں استعمال کیا کہ عبادت کے معنی پرستش کے نہیں ہوسکتے بلکہ محکومیت کے ہیں۔

عبادت کے معنی محکومی کو پیش نگاہ رکھ کر، پھر اس آیت پر نگاہ ڈالیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (51:56) ترجمہ: ہم نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ہمارے محکومی میں رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی محکومی میں صرف

اس وقت تک رہا جاسکتا جب آپ اس کی حکومت قائم کریں گے ہماری علمائے کرام عبادت کا ترجمہ پرستش کرتے ہیں اور اس آیۂ کریم کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ ہم نے جن وانس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری پرستش کریں۔ پرستش کرنے کے طریقے ہمارے ہاں نوافل لمبے لمبے چلے شمار کئے جاتے ہیں۔ اگر تخلیق انسانی کی غرض یہی رسومِ پرستش ادا کرتے رہنا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ رسوم دن رات میں چوبیس (24) گھنٹے تو ادا نہیں کی جاسکتیں۔ ان رسوم کی ادائیگی کے علاوہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں وہ مقصدِ تخلیق کے خلاف ہوگا۔ تخلیق کا مقصد اگر یہ رسوم پرستش ادا کرنا ہے تو یہ بزرگ حضرات بھی ہر وقت پرستش نہیں کرسکتے۔ آپ خود غور فرمائیں کہ اگر انسانی تخلیق کا مقصد صرف رسوم پرستش ادا کرتے رہنا ہوتا تو قرآن کریم وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (45:13) کیوں کہتا کہ یہ ساری کائنات تمہارے زیر تسخیر کردی گئی ہے۔ اُٹھو اور ان قوتوں کو قابو میں لاکر ان سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور ساری انسانیت کو بھی اس کا فائدہ پہنچاؤ۔ اسلامی مملکت کی اساس صفات خداوندی پر ہوتی ہے۔ اس کی صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنے میں پیدا کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ ان صفات کو اسلامی مملکت میں رائج کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (59:24) انسانی ذات، انسانی معاشرہ، جو خدا کی صفات پر استوار ہوگا۔ ان میں یہ صفات منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ ان صفات کو عملی پروگرام میں لانے کے لئے کائنات کی ہر چیز کوشش کررہی ہے۔ اس آیت میں لہ کا لام، لام فافع کہلاتا ہے۔ صفات خداوندی کو انسانیت کے لئے نافع بنانے کے لئے کائنات کی ہر چیز کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ صفات خداوندی کو ہر طرف پھیلاتے چلے جاؤ۔ ساری دنیا میں ان کو عملاً جاری کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت میں شریک ہوکر کائنات میں اضافے کرتے جاؤ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ (35:1) وہ اپنی مخلوق میں برابر اضافہ کرتا جارہا ہے۔ تمہارا بھی فرض ہے کہ اس کائنات میں اضافہ کرتے جاؤ اور اپنی کوشش اور محنت سے اس کائنات کو آگے بڑھاتے جاؤ۔ اسلامی مملکت کے ثمرات و برکات میں سے ایک ثمر ہے۔ اس کے دیگر ثمرات اس کے ذریعے خود بخود برآمد ہوجاتے ہیں۔ (اقتباس ہمارا مضمون، انسان کی تخلیق کا مقصد)

مضمون کے آخر میں ہم جناب عمران خان صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ ریاستِ مدینہ قائم کرنے کا ایک موقع تو پاکستان کے قیام کے فوری بعد تھا وہ موقع ہم نے گنوادیا جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں ریاستِ مدینہ کے تشکیل کرنے کا دوسرا موقع اب میسر آگیا ہے ہم جناب عمران خان صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس موقع کو Miss نہ کریں اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر تم اللہ کا دین قائم کروگے تو اللہ خود تمہاری مدد کرے گا (47:7)، تمہیں خود راستے دکھاتا چلا جائے گا (29:69)، ضرورت صرف عزم محکم اور Initiative لینے کی ہے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ کیسے اللہ آپ کی مدد کرتا ہے اور کیسے ہر جگہ اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (22:40)

ترجمہ: اور جو شخص خدا کی مدد کرے گا، خدا بھی البتہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔ بیشک خدا ضرور زبردست غالب ہے۔

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 10

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

کلیم الزماں کے پنیر والے پکوڑوں کی خوشبو ایوان عدالت میں پہنچی تو خواتین وکلا کی رگ مشام پھڑکی چنانچہ انہوں نے کلیم الزماں کے گھر پر دھاوا بولنے کا پروگرام بنایا۔ان میں سے دو ایک عالم آرا کی شناسا بھی تھیں چنانچہ شرم وشکایت کا کوئی موقع نہ تھا۔سہیلیاں اپنی سہیلی کے گھر جا رہی تھیں۔ وہ پہنچیں تو کلیم صاحب گھر میں موجود تھے ایک نے بڑھ کر کہا:

انکل: سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے کچھ وکلا سے آپ کے خیالات سے واقفیت حاصل کی اور اس سے بھی زیادہ پنیر والے پکوڑوں کی لذت سے آشنائی کا شوق ہمیں یہاں لے آیا ہے عالم آرا سے ملاقات بہانہ بن گئی ہے۔

کلیم الزماں: بیٹی! تمہاری صاف گوئی سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے لیکن افسوس کہ آج تمہیں پنیر والے پکوڑے نہیں مل سکتے کیونکہ پشاور سے آیا ہوا پنیر ختم ہو گیا۔ آلو گوبھی کے پکوڑوں سے اگر کام چلتا ہے تو ابھی اس کا انتظام ہو جائے گا۔ابھی میں پنیر کا آرڈر دے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر کلیم الزماں نے اپنا موبائل فون اٹھا کر اپنے دوست صدیقی صاحب کو پنیر بھیجنے کی فرمائش کر دی اور باتوں میں مشغول ہونے کے لئے عالم آرا سے کہا کہ تم نے اپنی دوست کا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔

عالم آرا: ابو! ان کا نام نشاط ہے۔ کالج میں میرے ساتھ پڑھتی تھیں۔ بی اے کرنے کے بعد لاء میں داخلہ لے لیا۔اب وکالت کرتی ہیں۔نئی نئی وکیل ہیں۔آپ سے لاء کے متعلق کچھ حاصل بھی کرنا چاہتی ہونگی۔

کلیم الزماں: واہ واہ بیٹی! تمہیں معلوم ہے کہ ہماری بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ سورہ النازعات کی پہلی آیت ہے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (79:1) سے اور دوسری آیت ہے وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (79:2) غالب نے کہا ہے کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

نشاط بیٹی سے مخاطب ہو کر، بیٹی! معلوم ہے نشاط کے معنی کیا ہیں؟

وکیل نشاط: انکل نشاط کا مطلب خوشی ہی ہے۔

کلیم الزماں: بیٹی! صرف خوشی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں تمہیں پچھلے دنوں ٹی وی پر ایک واقعہ دکھایا گیا۔کسی راہگیر کا

ایک بیگ راستے میں گر گیا۔ ایک کانسٹیبل نے وہ بیگ اٹھالیا اور انتظار کیا کہ بیگ کا مالک ضرور بیگ کو ڈھونڈنے کے لئے واپس آئیگا۔ بیگ میں بہت سا کیش اور زیورات تھے جیسا کہ کانسٹیبل کا خیال تھا۔ وہ راہگیر اپنے بیگ کو ڈھونڈتا ہوا واپس آیا تو کانسٹیبل نے وہ بیگ اس کے حوالے کر دیا اور کسی قسم کا انعام لینے سے انکار کر دیا۔ اگر کانسٹیبل بیگ لے کر چلا جاتا تو وہ دولت حاصل کرنے پر اسے بڑی خوشی ہوتی۔ ایسی خوشی اس وقت تک آپ کے ساتھ رہتی ہے جب تک دولت رہے۔ یہ بڑی کثیف قسم کی خوشی ہے لیکن بیگ واپس کرنے کے بعد کانسٹیبل کو جو خوشی ہوئی ہوگی وہ سرمدی ہے۔ یہ قرآنی نشاط ہے نہایت لطیف قسم کی خوشی۔ دوسری مثال دیتا ہوں۔ آپ گاڑی پر یا سائیکل پر جا رہے ہیں۔ ٹریفک بھی نہیں، آپ راستہ کاٹتے ہوئے آسانی سے جا سکتے ہیں لیکن نہیں آپ قانون کی پاسداری کرتے ہوئے چوک میں گول دائرے کا چکر لگا کر منزل کی طرف جاتے ہیں۔ قانون کی پاسداری سے آپ کے دل میں ایک ہلکی سی خوشی کی لہر دوڑتی ہے۔ یہ قرآنی نشاط ہے۔ قرآن نے اب تک یہ کہا ہے کہ جو کچھ حاصل کرو اسے قانون کے مطابق حاصل کرو اور جب اسے خرچ کرو تو وہ بھی قانون کے مطابق خرچ کرو یہ سب تعبید ہے، ٹریننگ ہے۔ اس کے بعد عبادت کا مرحلہ آتا ہے۔ ٹریننگ بھی عبادت ہی کا ایک حصہ تھی۔ آگے وہ مرحلہ آتا ہے جسے اقبال نے کہا ہے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کلیم صاحب کے شعر ختم کرتے ہی ان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے بات سنی اور پھر موبائل کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا کہ کل شام تک پنیر پہنچ جائے گا۔ آپ سب پرسوں تشریف لائیں اور مذکر حضرات کو بھی اس چھوٹی سی دعوت کی اطلاع کر دیں۔ ہاں عالم آرا کہہ رہی تھی کہ نشاط صاحبہ شعر بھی کہتی ہیں۔ کلیم الزماں (خوشی کا اظہار کرتے ہوئے) اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے وکیل کو اگر شعر و ادب سے شغف نہ ہو تو زندگی کامیاب ہو بھی تو بھی سپاٹ اور بے روح رہتی ہے۔ لٹریچر کو اس طرح سمجھئے جیسے پکوڑوں میں نمک (سب ہنستے ہیں)۔

عالم آرا: ابو نشاط صاحبہ کی آواز بڑی سریلی ہے، گاتی بھی ہیں۔

کلیم الزماں: یہ تو سونے پہ سہاگہ ہو گیا (نشاط سے مخاطب ہو کر) بیٹی اپنے کچھ اشعار سناؤ۔

نشاط: انکل بصد احترام معذرت چاہوں گی۔ میری شاعری تک بندی کے سوا اور کچھ نہیں ایسے ہی ہم نشینوں میں جگ ہنسائی ہوگی۔

کلیم الزماں: ہمیں اپنے کچھ پسندیدہ اشعار ہی سنا دو تاکہ محفل زندہ زندہ سی لگے اور آپ کے انتخاب کا بھی علم ہو جائے، کسی شاعر نے کہا ہے کہ

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

انکل! ویسے تو اردو ادب میں بے شمار اشعار انتخاب کے لئے مل جاتے ہیں مگر مجھے سراج اورنگ آبادی کے یہ شعر بہت پسند ہیں۔ آخری شعر کے متعلق معلوم نہیں کہ سراج ہی کا ہے یا کسی اور کا لیکن تغزل کا رنگ وہی ہے۔

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی

نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے ادا کروں
کہ شرابِ حسرت وآرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی
وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑیں
یہ مری جبینِ نیاز تھی جو جہاں دھری سو دھری رہی

کلیم الزماں: جو بڑے غور سے اشعار سن رہے تھے واہ واہ کئے بغیر نہ رہ سکے اور نشاط سے مخاطب ہو کر کہا، بیٹی! تمہارے انتخاب اشعار سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم پاکٹ مار نہیں بن سکتیں نہ جھوٹ بول سکتی ہو نہ بلوا سکتی ہو ،لہذا تم اپنے پیشہ میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتیں، عدالت میں بھی تمہاری حالت یہی رہے گی کہ

میں سچ کہونگی مگر پھر بھی ہار جاؤنگی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دیگا

میں تصور کرسکتا ہوں کہ تمہاری وکالت کامیاب نہیں رہے گی۔ میں تجویز یہ پیش کرتا ہوں کہ تم وکالت بھی کرتی رہو اور ہمارے نخل سینا سکول میں پارٹ ٹائم ملازمت کرلو۔ تمہاری شخصیت میں مجھے ایک اچھا استاد نظر آتا ہے۔کلیم الزمان کی بات سن کر عالم آرا اور نشاط کی ایک وکیل سہیلی بول اٹھی کہ لو جی! یہ تو وہی بات ہوگئی کہ آگ لینے گئے اور پیغمبری مل گئی۔

کلیم الزماں: بیٹی! سنو استاد بھی پیغمبر کی طرح ہوتا ہے دونوں میں فرق یہ ہے کہ پیغمبر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت بذریعہ وحی ملتی ہے اور استاد کو ہدایت پیغمبر کے ذریعہ ملتی ہے دونوں کا کام ایک جیسا ہے۔اسی لئے پیغمبر کو بعض اوقات لوگ معلم بھی کہتے ہیں۔وکیل شائستہ جبین جو ابھی تک خاموشی سے باتیں سن رہی تھی جب آلو گوبی کے پکوڑے کھانے سے فارغ ہوئی تو کلیم صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ انکل! اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔میں اشفاق احمد صاحب مرحوم کے ڈرامے ٹی وی پر دیکھتی رہی ہوں۔جناب قدرت اللہ شہاب مرحوم نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں بہت سے خرق عادت واقعہ کا ذکر کیا ہے اور ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب " گریباں چاک " میں بھی ایک خرق عادت عادت واقعہ کا ذکر کیا ہے جو بھٹو مرحوم کی موت سے تعلق رکھتا ہے۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایسے واقعات کے متعلق علامہ پرویز مرحوم کا کیا مؤقف تھا۔ میں آپ سے اسلئے پوچھ رہی ہوں کہ میری معلومات کے مطابق علامہ مرحوم کی نگارشات کا آپکی زندگی پر بہت اثر ہوا ہے۔

کلیم الزمان: بیٹی! علامہ پرویز کا موضوع صرف قران مجید ہے جس کی تفسیر میں انہوں نے اپنی پوری زندگی لگادی ،تم یہ سن کر حیران ہوگی کہ قائداعظمؒ نے قرآن کا فلسفۂ زندگی علامہ پرویز سے پڑھا تھا۔ علامہ پرویز واحد شخص تھے جو قائد اعظم کو بغیر پیشگی اجازت ملنے جایا کرتے تھے۔خرق عادت واقعات کے متعلق ان کا موقف تھا کہ ایسے واقعات بھی کسی قانون الٰہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔

شائستہ جبیں: انکل! یہ بھی پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ وہ نماز کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے؟

کلیم الزماں: جہاں تک میں نے ان کے لٹریچر کا

مطالعہ کیا ہے اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف انہیں بدنام کرنے کے لئے پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ ہاں وہ ایسی نمازوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، جن کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

سطوتِ اسلام قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

شائستہ بیٹی! بی اے میں آپ کے کون کونسے مضامین تھے اور خاص دلچسپی کس مضمون سے رہی؟

شائستہ: انکل! اختیاری مضمون میں مجھے پولیٹیکل سائنس سے دلچسپی رہی ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری بھی مجھے اچھی لگتی ہے۔ انگریزی بس واجبی ہی سمجھئے۔

کلیم الزماں: اردو شاعری سے بھی شغف ہے اور پولیٹیکل سائنس مرغوب مضمون ہے تو میں تمہیں ایک تجویز دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم علامہ اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کا مطالعہ غور سے کرو اور پولیٹیکل تصورات اور اپنے ملک کے حالات خصوصاً حالیہ الیکشن کے حوالے سے کوئی رائے قائم کرو۔ مجھے امید ہے کہ ایسا کرنے سے تمہارے دل و دماغ روشن ہو جائیں گے۔ بڑے بڑے دانشور جمہوریت جمہوریت کا راگ الاپ رہے ہیں جمہوریت کی اصل حقیقت کو کوئی نہیں جانتا اور اگر کوئی جانتا ہے اور خاموش رہتا ہے تو منافقت کا ارتکاب کرتا ہے۔ آپ لوگ جب پرسوں تشریف لائیں گے تو انشاء اللہ پنیری پکوڑوں کے ساتھ ساتھ خرق عادت واقعات پر اور جمہوریت اور اسلام سے متعلق مسلمانوں کے رویے وغیرہ اور دوسرے موضوعات پر گفتگو ہوگی۔ آپ بھی تیار ہو کر آئیں ہوسکتا ہے کہ آپ کی معرفت علامہ کی یہ دعا پوری ہو جائے کہ "جوانوں کو پیروں کا استاد کر" اس وقت تو میں آپ سے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ ارکان اسلام کی تعبید کے بعد عملی طور پر عبادت کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ آپ سیاست کریں، وکالت کریں یا تجارت یا آپ کا تعلق تعلیم و تدریس سے ہو، باورچی خانہ ہو یا بیوٹی پارلر سے، جو کچھ بھی آپ کریں اسے عبادت سمجھ کر کریں۔ میرا یہی مشورہ ان لوگوں کو بھی ہے جن کا تعلق خرید و فروخت سے ہے۔ الغرض مسلمان کی ساری زندگی اگر قرآن مجید کے مطابق ہے تو وہ عبادت ہے، اب آپ لوگ خوش گپیاں کریں، پرسوں انشاءاللہ سیر حاصل گفتگو ہوگی۔

فیصل آباد کے احباب کے لئے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین
فیصل آباد میں ہماری دو بزموں کے
علاوہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھی مل سکتے ہیں۔



فون نمبر:
0322-6386991

حکیم عبدالمجید
ہاؤس نمبر P-1479 سٹریٹ نمبر 1، محلہ فتح آباد، فیصل آباد

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر 20)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

2۔ علمُ الکلام کے جبر و قدر کا الٰہیاتی لاینحل مسئلہ:

عمومی طور پر دیکھا گیا ہے مسئلہ جبر و قدر کو مذہب کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے، جسے فلاسفی کے علمُ الکلام میں ایک الٰہیاتی مسئلہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ صدیوں سے یہ مسئلہ پیش کیا جا رہا ہے اور اِسے مسئلہ لاینحل قرار دے کر درگذر کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا مقالہ کے آخر میں اس کے حل کرنے کی کوشش کرنا ضروری خیال کیا جا رہا ہے تاکہ کسی شک کی گنجائش نہ رہے۔

زمانۂ قدیم سے یہ لاینحل مسئلہ یوں پیش کیا جاتا ہے کہ:

> ''اگر خدا قادرِ مطلق اور عالمِ حقیقی ہے تو جو کچھ ہوتا ہے اسی سے ہوتا ہے اور اس کے پیشگی علم میں ہوتا ہے۔ اگر نیک عمل انسان کرتا ہے تو خدا کے علم کے مطابق کرتا ہے اور برا کام کرتا ہے تو وہ بھی خدا کے علم کے مطابق کرتا ہے۔ نیک عمل کی صورت میں انسان کا عمل آزاد نہیں ہوگا اور بُرا کام کرنے کی صورت میں وہ گنہگار نہیں کہلایا جا سکتا۔''

اگر تسلیم کیا جائے کہ خدا صاحبِ اختیار و ارادہ، مخلوق کے بارے میں وہ تک بھی جانتا ہے، جو اس کے ابھی خیالات میں بھی نہیں آیا تو مسائل سامنے آئیں گے کہ کیا:

1۔ صاحبِ اختیار و ارادہ ہستی، اگر علمِ الٰہی سے مختلف کرے، تو پھر علمِ الٰہی کا کیا بنے گا؟ اور

2۔ اگر صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق علمِ الٰہی کے مطابق ہی عمل کرنے پر مجبور ہے، تو پھر انسان کا اختیار و ارادہ کہاں گیا؟

لہٰذا اگر ہمیں اِس الٰہیاتی مسئلہ کے حل میں انسانی آزادیِ ارادہ کے نظریہ پر یقین رکھنا ہے، تو ہمیں درجِ ذیل مفروضہ کو ثابت کر کے یقین کرنا ہوگا کہ

صاحبِ اختیار انسان کے دل میں جو خیالات ابھی وجود پذیر نہیں ہوئے، یا انسان نے وجود پذیر امکانات میں سے جو کچھ انتخاب کرنا ہے، اس کا علم خدا نے اپنی مشیت سے اپنے پاس رکھا ہی نہیں ہے، اِس لئے کہ انسان کا اختیار و ارادہ برقرار رہے، ورنہ

1۔ وہ علم خداوندی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

2۔ مزید اِس لئے بھی کہ انسان کے دل میں مختلف امکانات جو بھی ہوتے ہیں، ان میں سے وہ کسی ایک کو اپنی مرضی و آزادیِ ارادہ سے بِلا جبر منتخب کرنے میں نااہل ہو جائے گا۔

فِلاسفرز/منطقیین نے تو ایسے نظریہ ہی کو محال قرار دے کر اپنی جان چُھڑا لی، لیکن سازش کی بِنا پر یہ مسئلہ جمہور میں تشہیر پا کر صدیوں سے ہر جگہ باعثِ اختلاف بنا ہوا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ سے جان چھڑانا ممکن نہیں رہا اور قرآن کی روشنی میں مسئلہ کے منطقی طور پر درست حل نکالنے کی کوشش کرنے کی اشد ضرورت کی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے مذاہب کے علاوہ نسل در نسل ہر مسلمان، منبر و محراب سے سنتا چلا آ رہا ہے کہ خدا ہر شے سے باخبر ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝ (10:40)

اور ان لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں، جو ایمان لے آئیں گے، اور وہ بھی ہیں، جو کبھی ایمان نہیں لائیں گے، اور اللہ، فساد برپا کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

جب قرآن لوگوں کے متعلق یہ کہے کہ ''ان میں ایسے بھی ہیں، جو اس پر ایمان لے آئیں گے'' تو خدا اُس وقت، ان لوگوں کے دلوں میں گزرنے والے خیالات و رجحانات کی بنا پر ایسا کہتا ہے۔ اِس سے یہ فرض کرنے کا جواز نہیں بنتا کہ انسان مجبور ہے۔ ایسا کہنے کے بعد خدا انکار کر دینے کا ان کا اختیار و ارادہ سلب نہیں کر لیتا۔ وہ ڈکٹیٹر کی طرح بات نہیں کرتا کہ اب جبکہ ہم نے کہہ دیا ہے کہ ''وہ ایمان لے آئیں گے'' تو اب ان کے اندر انکار کی صلاحیّت ہی ہم نے سلب کر لی ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ انسان اپنے اختیار و ارادہ کے سبب ایمان بھی لا سکتا ہے اور انکار بھی کر سکتا ہے۔ جن کے بارے میں کہا گیا کہ ''وہ ایمان لے آئیں گے'' تو ضروری نہیں کہ وہ سب ایمان لے آئیں۔ اس بات کا امکان پھر بھی رہتا ہے کہ ان میں سے بعض ایمان نہ بھی لائیں، کیونکہ اختیار و ارادہ تو ان کا برقرار ہے، سلب نہیں کیا گیا۔ تو انسان کے اختیار و ارادہ کے سبب کچھ بھی ممکن ہے۔

لہٰذا ہمیں ہرگز نہیں بھولنا چاہیئے کہ انسان کا اختیار و ارادہ، خدا ایک لمحہ کے لئے بھی سلب نہیں کرتا۔ اِس لئے کہ ذرائع رشد و ہدایت (انبیاء، کتب اور فرشتوں پر ایمان) اور ان ذرائع کا سرچشمہ یعنی خدا پر ایمان اور قانون مکافات (یعنی ایمان بالآخرۃ)، اس وقت تک با مقصد نہیں رہتے، جب تک انسان کا اختیار و ارادہ برقرار نہ رہے۔ منفی و مثبت فیصلے کی صلاحیّت انسان میں ہر وقت برقرار رہتی ہے۔ تو پھر کیا ایسا نہیں کہ صاحب اختیار انسان کے دل میں جو خیالات ابھی وجود پذیر نہیں ہوئے، یا انسان نے وجود پذیر امکانات میں سے جو کچھ انتخاب کرنا ہے، اس کا علم خدا نے اپنے پاس رکھا ہی نہیں ہے، تاکہ انسان کا اختیار و ارادہ برقرار رہے، اور وہ علم خداوندی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ ویسے بھی خدا نے یہی کہا ہے کہ ''ہم ہر شے سے واقف ہیں، یہاں تک کہ دلوں میں گزرنے والے خیالات سے بھی''۔ لہٰذا خدا ہر شے سے ضرور واقف ہے، لیکن جس شے سے وہ واقف ہے اس کو ''شے'' کے زمرے میں آنا چاہیئے۔ دلوں میں گزرنے والے خیالات ''شے'' کے

زمرے میں آتے ہیں اس لئے خدا ان سے واقف ہے، لیکن جو خیالات ابھی ذہنِ انسانی میں نہیں آئے یا مختلف امکانات میں سے کسی ایک کا انتخاب اگر ابھی عمل میں نہیں آیا ہے، تو ذہن میں غیر موجود خیالات اور امکانات میں سے جس کا انتخاب ابھی عمل میں نہیں آیا یہ دونوں ''شے'' کے زمرے میں آتے ہی نہیں ہیں۔ اس لئے وہ خیالات جو ابھی دلوں میں نہیں گزرے، یا وہ انتخاب جو ابھی عمل میں نہیں آیا، ان کو خدا نے اپنے علم میں جان بوجھ کر نہیں رکھا، تاکہ انسان کا اختیار و ارادہ مجروح نہ ہونے پائے۔ اگر اللہ چاہتا تو انسان کے غیر موجود خیالات اور امکانات میں سے غیر فیصلہ کن انتخاب کا علم بھی اپنے پاس رکھ سکتا تھا، لیکن پھر انسان کا اختیار و ارادہ سامنے آ کھڑا ہوتا۔ خدا نے خود اپنے ہی اختیار سے شے کا علم رکھنے سے انسان کے غیر موجود خیالات، اور غیر منتخب امکانات سے متعلق علم کے بارے میں اپنے علم کو محدود کر لیا ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾ (2:29)

اللہ ہر ''شے'' سے آگاہ ہے۔

امام راغب کے نزدیک ''شے'' لفظ ہر موجودہ چیز کے لئے بولا جائے گا، خواہ وہ محسوس طور پر موجود ہو، جس کا علم حاصل کیا جا سکے، مثلاً اجسام، یا پھر محض ذہنی طور پر موجود ہوں، جس کے متعلق کچھ خبر دی جا سکے مثلاً اقوال۔ یہ تو ہوئی شے سے متعلق انسانی علم کی حالت۔ جبکہ خدا تو محسوس و غیر محسوس اشیاء سے بھی واقف ہے، اور انسانی خیالات جو دل میں موجود ہوں، اِن سے بھی واقف ہے۔ شے کا اطلاق ہر اس محسوس و غیر محسوس شے پر ہوتا ہے جو فی الحقیقت موجود ہو، جو تخلیق پا چکی ہو، یہاں تک کہ دل میں مچلنے والے (موجودہ) خیالات تک پر بھی ''شے'' کا اطلاق ہوتا ہے، کیونکہ وہ انسان کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔

خدا، انسان کے دل میں جو بات موجود ہوتی ہے، صرف اس کے بارے میں بات کرتا ہے، نہ کہ انسان کے آئندہ بدلتے ارادوں کے بارے میں۔ خدا نے قدرت کے باوجود انسان کے اُن ارادوں کا علم اپنے پاس نہیں رکھا، جو ابھی اس کے دل میں نہیں آئے حالانکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔

اِن کی وضاحت خود قرآن سے بھی ملتی ہے جِن میں حتمی بات کہنے کی بجائے خدا نے ''یا'' اور ''اگر'' کے ساتھ بات کی ہے، جو کسی طرح بھی حتمی بات کے زمرہ میں نہیں آتی۔ ''فیصلہ کن گھڑی یا مدّت عمل'' کے اختتام سے تو خدا آگاہ ہے، لیکن اس میں کمی یا بیشی کا دارومدار انسانی اعمال پر منحصر ہے، کیونکہ انسان میں اس بات کی صلاحیّت رکھ دی گئی ہے کہ چاہے تو وہ تیزی کے ساتھ فیصلہ کن گھڑی کی طرف بڑھانے والے اعمال کر کے، فیصلہ کُن گھڑی کی طرف بڑھ جائے، یا تیزی کے ساتھ فیصلہ کن گھڑی سے دور لے جانے والے اعمال کر کے فیصلہ کن گھڑی سے دور ہو جائے اور اپنی مدّت عمل کو لمبا کر لے۔

اِس کی وضاحت ہم قرآن کی متعدد آیات میں پاتے ہیں۔ اِن میں ایک آیت کا حوالہ دے کر وضاحت کئے دیتے ہیں۔

2۔ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (40:77)

پس (اے رسول!) دین کے پروگرام پر ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہو۔ بے شک خدا کے وعدے سچّے ہیں، وہ اسی طرح ہوکر رہیں گے (یہ الگ بات ہے کہ) ان میں سے بعض وعیدیں تمہاری زندگی میں سامنے آجائیں یا تمہاری وفات کے بعد ظہور میں آئیں۔

اللہ کا متبادل شرائط پر مبنی علم اپنے پاس رکھنے کے بیان کی منطقی طور پر یہی توجیہ اخذ کی جاسکتی ہے کہ انسان کو اللہ نے اپنی مرضی کے مطابق یہ قانون بنا کر کھلی آزادی دے دی ہے کہ جو عمل وہ اپنی مرضی سے کرنا چاہتا ہے وہ اس کے نتائج برداشت کرنے کی حد میں رہ کر اُن کو آزادانہ طور پر کرسکتا ہے۔

اِس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اِس سے تو اللہ کے قادرِ مُطلق ہونے پر شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ اِس سے اللہ کے قادرِ مُطلق ہونے پر کوئی قدغن نہیں لگتی کیونکہ اُس نے خود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کی ہے کہ

1۔ وہ انسان کی طرف سے اپنی مرضی سے کئے گئے اعمال اور جو مجموعہ ہوتے ہیں اُسی کی مرضی سے دلوں میں آنے والے خیالات، رجحانات، میلانات اور ارادوں کا، وہ اِن سبھی میں مداخلت نہیں کرے گا۔

2۔ اور نہ ہی ذہن میں آئے ہوئے خیالات، رجحانات، میلانات اور ارادوں میں سے انسان کے انتخاب کے معاملے میں مداخلت کرے گا۔

3۔ زمان و مکان کی حدود میں رہتے ہوئے سمجھنے کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ انسانی علم کی رو سے خدا نے یہ علم اپنے پاس قدرت کے باوجود خود ہی نہیں رکھا۔ انسان کے سینوں میں، دلوں میں، کیا ارادے، خیالات و رجحانات، میلانات آئندہ آئیں گے۔ وہ انسان کے ان خیالات سے واقف ہے جو دلوں اور سینوں میں موجود ہیں۔ خدا نے انسان کے سینوں میں مچلتے خیالات، رجحانات و میلانات میں سے انسان کے انتخاب کا علم بھی اپنے پاس نہیں رکھا، اِس لئے اِن کا تعلق پلاننگ کے تناظر میں انسانی عالمِ امر سے جوڑا جاتا ہے، جو وضاحت طلب ہے۔

انسان کا عالمِ امر:

انسان کے عالمِ امر کے اس گوشے میں نئے نئے خیالات انسانی ذہن میں بجلی کی چمک کی مانند کوند کر آتے رہتے ہیں۔ یہ کہاں سے خیالات آتے ہیں یہ معلوم نہیں ہے۔ انسانی ذات نے مختلف خیالات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ انتخاب کرنے کے لئے انسان موجود درپیش حالات؛ دستیاب ذرائع و وسائل؛ اور اپنی علم کی موجودہ سطح کو مدّنظر رکھتا ہے۔

دستیاب ذرائع، موجود درپیش حالات اور موجودہ علمی سطح کے پیشِ نظر انسان اپنے ذہن میں پروگرامنگ کرتا ہے۔ یہ پروگرامنگ خالصتاً انسانی ذات کا فعل ہے۔ اپنی پروگرامنگ سے انسان خود آگاہ ہوتا ہے اور خدا بھی انسان کے دل میں گزرنے والی پروگرامنگ اور دل میں مچلتے خیالات سے آگاہ ہوتا ہے۔ انسان کی ذات، غیر نشوونما یافتہ یا خوابیدہ حالت میں ہوتی، جسے انسان نے اپنی طبیعی زندگی میں نشوونما دینا ہوتی ہے۔ اللہ کی ذات لامحدود ہوتی ہے، لیکن انسان کی محدودیت کی

وجہ سے اِس کی نظر ''کُل'' حالات پر نہیں ہوتی، اس لئے اس کی پروگرامنگ میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پروگراموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینے کے بعد بھی اس کو اپنے پروگرام میں ردّ و بدل کی ضرورت رہتی ہے اور غلط پروگرام پر عمل درآمد کر لینے پر، اسے پچھتاوا بھی ہوتا ہے۔ وہ ردّ و بدل یا پروگرامینگ، جو انسان کے دل میں شے کے طور پر وقوع پذیر ہو چکی ہیں، اس سے انسان اور خدا دونوں برابر آگاہ ہوتے ہیں۔

وہ امکانات جو انسان کے عالم امر میں، غائب میں موجود ہیں، ان سے خود انسان، اُس وقت تک واقف نہیں ہوتا، جب تک وہ ذہن میں شے بن کر نہیں آجاتے، البتہ خدا جانتا ہے کہ انسان کے عالم امر میں کیا کیا امکانات غائب میں موجود ہیں۔

امکانات کا ذہن میں ابھر کر سامنے آجانے کے بعد ہی انسان کے انتخاب کا مرحلہ آتا ہے، جو خالصتاً انسانی ذات کا فعل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو اپنی مرضی سے، اپنے اختیار و ارادے سے، مختلف اِمکانات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ انتخاب سے قبل انسان کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے کہ کون سے امکان کا انتخاب کیا جائے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں انتخاب سے قبل خود انسان کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کون سے امکان کا انتخاب کیا جائے گا، اور خدا نے بھی یہ علم اپنے پاس نہیں رکھا کہ انسان مختلف ممکنات میں سے کس امکان کا انتخاب کرے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر خدا چاہتا، تو انسان کے اس گوشے سے متعلق علم بھی اپنے پاس رکھ لیتا، لیکن خدا نے انسان کے اختیار و ارادے میں مداخلت کرنا نہ چاہی، اس لئے، اس مقام یا گوشے کا علم نہ صرف خدا نے اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ انسان سے بھی مخفی رکھا، تاکہ انسان بھرپور غور و فکر اور تدبّر کرنے اور کشمکش سے گزرتے ہوئے مکمل آزادی کے ساتھ کسی ایک امکان کا انتخاب کرے۔ اگر انسان کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ کیا انتخاب کرنا ہے تو ''ابلیس و آدم'' کی کشمکش تو ختم ہو جاتی اور کش مکش کے بغیر انسانی ذات کا ارتقاء ہونا ممکن نہ تھا۔ مختلف امکانات میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینے کے بعد، انسان خود بھی اپنے انتخاب سے آگاہ ہو جاتا ہے، اور دل میں موجود شے ہونے کی وجہ سے خدا بھی انسان کے انتخاب سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اس طریق سے انسان کا اختیار و ارادہ برقرار رہتا ہے اور وہ اپنے انتخاب کے نتائج کا خود ذمّہ دار ہوتا ہے۔ اگر خدا کو انسان کے انتخاب کا علم، پہلے سے ہوتا، تو پھر انسان مجبورً اعلم الٰہی کے مطابق اعمال کا انتخاب کرتا اور پھر یہ اپنے کسی عمل کے نتیجے کا ذمہ دار بھی نہ ہوتا۔ اگر انسان علم الٰہی کے مطابق عمل نہ کرتا اور علم الٰہی سے مختلف کرتا، تو پھر خدا کے علم کا کیا بنتا؟

الٰہیاتی مسئلہ کی دوسری شِق قدرت کو انسانی اعمال سے منفی کرنے کا موقف:

قرآن کا واضح اعلان ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (2:109)

اللہ ہر ''شے'' پر قدرت رکھتا ہے۔

اگر ہم قدرت کو انسانی اعمال سے منفی کر دیتے ہیں تو انسان کو اپنے مجرمانہ اعمال کو جوابدہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ لہذا جہاں

تک انسانی مُجرمانہ اعمال کے نتائج کا تعلق ہے تو اس الٰہیاتی مسئلہ کے دو حصے ہیں

1۔ ایک یہ کہ اگر انسانی افعال کا سلسلہ وجوباً خدا پر منتہی ہوتا ہے تو وہ کبھی مجرمانہ نہیں قرار پا سکتے کیونکہ جس ذات سے یہ صادر ہوتے ہیں وہ الکمال ہے لہٰذا اس کی مشیت کسی ایسی چیز سے متعلق نہیں ہو سکتی جو خیر محض اور سراپا متحسن نہ ہو۔

2۔ دوسرے یہ کہ انسانی افعال کو مجرمانہ قرار دیا جائے تو پھر خدا کی ذات سے اس غیر محدود کمال کو سلب کرنا پڑے گا جس سے ہم اس کو متصف سمجھتے ہیں اور مخلوقات کے تمام معاصی اور مفاسدِ اخلاق کا اسی کو اصلی و حقیقی فاعل ماننا پڑے گا۔

لہٰذا الٰہیاتی مسئلہ کے مفروضوں کے اِن قضایا کی موجودگی میں انسان کو اپنے افعال میں آزادی اور خدا کے عالم الغیب ہونے میں مصالحت و تطبیق یا خدا کو خالق کل مان کر پھر خالق معصیّت ہونے سے بری رکھنا، فلسفہ کے بس کی بات نہیں رہی۔ عقل کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ ان اسرار کے مقابلہ میں آ کر اپنی ناروا دلیری و بے باکی کو محسوس کرے۔ قضیہ کی یہ دونوں صورتیں چونکہ خود متضاد ہونے کی بِنا پر منطقی طور پر بطور الحق بیک وقت برقرار رہنے میں محال ہیں۔ اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ خود یہ الٰہیاتی نظریہ ہی غالباً صحیح نہیں ہے جس کے یہ نتائج ہیں اور جس پر سارے اعتراضات وارد ہوتے ہیں اس لیے کہ منطقی طور پر جو نظریہ مستلزم محال ہو وہ خود محال ہوتا ہے۔

خدا نے عالم خلق میں، عالم امر میں بنائے ہوئے، اپنے ہی قوانین کی پابندی، اپنے اوپر عائد کر کے، انسان کے عالمِ تخلیق میں نہ آنے والا علم اپنے پاس خود ہی نہیں رکھا، تاکہ انسان کا اختیار و ارادہ برقرار رہے۔ انسان کے اندر اختیار و ارادہ ایسی شے ہے، جسے کسی بھی حالت میں خدا سلب نہیں کرتا۔ لہٰذا جو عقیدہ یا نظریہ، انسان کے اختیار و ارادے کو سلب کرے، وہ قرآن کے منافی ہے۔ لہٰذا اگر قرآن کی کسی آیت کا مفہوم، انسان کے اختیار و ارادے کو سلب کرتا ہو، تو وہ قرآنی مفہوم نہیں بلکہ انسان کے فہم کی غلطی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔

اختیار و ارادہ کے بارے میں یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اگر کوئی صاحب اختیار و ارادہ ذات، اپنے اختیار پر خود کوئی پابندی عائد کر لے، تو اس سے وہ ذات مجبور نہیں ہو جاتی۔ مثلاً اگر میں خود بغیر کسی جبر کے یہ فیصلہ کروں کہ میں روزانہ صبح سویرے اٹھ کر دو میل کی سیر کروں گا، تو میرا یہ فیصلہ مجھے مجبور نہیں بناتا، بلکہ میرا یہ فیصلہ میرے اختیار و ارادے کا مظہر ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے میرے اختیار و ارادے کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اِس لئے خدا جب اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کی پابندی کرتا ہے، تو وہ مجبور نہیں ہو جاتا۔ یہ پابندی تو مجبوری کے برعکس اُس کی ذات کے مُطلق اختیار کی غمازی کرتی ہے۔

3۔ مسئلہ جبر و قدر کا مطالعہ نظریہ ارتقاء کے تناظر میں۔

نظریہِ ارتقاء میں ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے نچلی کڑی جمادات کی ہے جہاں نہ حرکت نظر آتی ہے، نہ نشوونما اور نہ اختیار و ارادہ۔ یہاں پتھر اور دھاتیں میکانکی طاقتوں کی مطیع و فرماں بردار ہیں۔

اس کے بعد نباتات کا سلسلہ آتا ہے۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ پودے حرکت تو نہیں کر سکتے لیکن پھلتے پھولتے ضرور

ہیں۔ اگنے کے لیے انھیں خاص قسم کی زمین اور خوراک چاہیے۔ یہ نہیں کہ بیج کو جہاں چاہا بو دیا۔ لہٰذا پودے میکانکی طاقتوں کے رحم و کرم پر نہیں ہوتے۔ ان کی اپنی خاصیت کے مطابق انھیں خوراک، زمین اور پانی ملنا چاہیے۔ یہاں پر اختیار ذاتی کی تھوڑی سے جھلک دکھائی دیتی ہے۔

نباتات سے آگے بڑھے تو حیوانات آتے ہیں یہ حرکت بھی کر سکتے ہیں، پھلتے پھولتے بھی ہیں اور اختیار و ارادے کے مالک بھی ہوتے ہیں لیکن اختیار و ارادہ فطری اور جبلی تقاضوں تک محدود ہوتا ہے مثلاً بطخ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کی طرف دوڑتا ہے لیکن مرغی کا بچہ پانی کے پاس نہیں پھٹکتا۔ یہ اختلاف فطری تقاضوں کی بنا پر ہے اور حیوانات کو اس بارے میں کوئی آزادی نہیں دی گئی، لیکن بعض اور چیزیں ہیں جہاں اختیار و ارادہ کارفرما نظر آتا ہے۔ گائے کو بھوک لگتی ہے تو گھاس کھاتی ہے، کبھی چل پڑتی ہے، کبھی بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی نشوونما کے اصول اس کی جسمانی ساخت پر مبنی ہیں۔ فطری اور جبلی تقاضوں کو ہر ممکن ذریعے سے پورا کیا جاتا ہے، جب ایک ذریعہ ناکام ہو جاتا ہے تو دوسرا اختیار کر لیا جاتا ہے۔

حیوانات کے بعد جب ہم انسان کی منزل پر پہنچتے ہیں تو آزادی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں تک انسان کی طبیعی/ مادی زندگی یعنی حیوانی زندگی کا تعلق ہے، وہاں میکانکی/ جبلی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں اور ان کی اطاعت کرنے پر انسان مجبور ہوتا ہے۔ اِس کے آگے انسانی ذات کی اخلاقی و روحانی زندگی شروع ہوتی ہے، جہاں انسانی ذات اپنے اختیار و ارادہ سے انتخاب کرنے میں مکمل آزاد ہوتی ہے۔

جوں جوں ارتقائی منازل طے ہوتی جاتی ہیں جبریت کا اقتدار گھٹتا جاتا ہے اور قدریت کا اقتدار بڑھتا جاتا ہے نچلے درجے پر جبریت کا مکمل تسلط ہے، لیکن چوٹی پر قدریت کی سلطنت ہے۔ دیکھا جائے تو دراصل سکونی اور حرکی دونوں جبر و قدر کی قوتیں انسانی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب سکونی طاقتیں زور پر ہوتی ہیں تو انسان بے دست و پا نظر آتا ہے اور جب متحرک طاقتیں کام کرتی ہیں تو انسان آزاد دکھائی دیتا ہے، لہٰذا ذات ہی کے مجبور یا آزاد ہونے کا مسلۂ ہمارے پیشِ نظر رہتا ہے۔ اگر بیرونی اسباب کردار پر اثر انداز ہوں اور انتخاب کا تعین کریں تو آزادی نظر نہیں آتی لیکن اگر اصولوں کی اپنے انتخاب سے پیروی کی جائے تو ایسے کردار میں جبریت کی غلامی کا وجود دکھائی نہیں دیتا۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اِس کی یوں وضاحت کی ہے کہ انسان کی طبیعی/ جسمانی زندگی جبلی داعیات، طبیعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کے عمل پر مشتمل ہے۔ اِن پر کنٹرول نہ کیا جائے تو وہ حیوانی زندگی کہلاتی ہے، اِس لیے جب بھی انسان ذات کی نشوونما کے لیے قدم اٹھاتے ہوئے اسے ایک زندہ، محرک اور مستحکم بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو پھر یہی جسمانی تقاضے اس کے ارادے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اِن کا مزاحم ہونا البتہ اِس تناظر میں دیکھا جاتا ہے کہ اِن پر قابو پا کر ہی ذات کی مزید نشوونما پانے اور نشوونما میں بھی اضافہ کرنے کا باعث بننا ممکن ہوتا ہے۔

مادی نظریہِ حیات میں انسان کی طبیعی زندگی کو ہی اِس دنیا میں ارتقاء کی آخری کڑی سمجھنے والے انسانی ذات سے انکار

کرتے ہیں۔ لہٰذا اُن کے نظریہ میں انسان کی حیوانی زندگی کے متعلق نظریہ جبریت کی حکمرانی کے موضوع پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔ اِن کے برعکس انسانی ذات پر ایمان رکھنے کے مقام پر فائز آزادیِ ارادہ و اختیار کی صلاحیت کے حامل ہو کر البتہ نظریہ جبریت کا ابطال کرتے ہیں۔

مسئلہ جبر و قدر میں جبریت کا قرآن میں کفار و مشرکین کی گمراہ روش قرار:

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ:

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (36:47)

سورۂ یٰسین میں ہے کہ جب ان سرمایہ داروں سے کہا جاتا ہے کہ اپنی دولت سے غریبوں کی روٹی کا بندوبست کرو تو یہ کفار مومنین سے کہتے ہیں۔ ''واہ! تم یہ عجیب بات کہتے ہو۔ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ انھیں ضرور رزق دے دیتا''۔ ''ان سے کہو کہ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ تم بڑے ہی گمراہ ہو''۔

آج کی نئی ریسرچ کے مطابق منطقی دلائل دیتے ہوئے ہم عقل سے دو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ایک عقلی طریقہ ہے، جسے اقبالؒ ''عقل خود بیں'' کہتا ہے۔ ایسی عقل کو اپنے مفاد کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا اور دوسری ہے، جسے اقبالؒ ''عقل جہاں بیں'' کہتا ہے۔ یہ عقل سب کا خیال رکھتی ہے۔ قرآن میں کافروں کی فریب کارانہ دلیل دی ہوئی ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم ان لوگوں کے رزق کا کچھ ایسا انتظام کرو کہ جس میں ان لوگوں کو خدا کا عطا کردہ رزق ملتا چلا جائے، رزق کو کھلا رکھو، تو جن لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں، جن کو خدا چاہتا تو (خود) کھلاتا (36:47)۔ اس آیت میں بات یہ ہوئی ہے کہ جو لوگ نظامِ ربوبیّتِ خداوندی کے منکر ہیں وہ کافر ہیں، اور جو خدا کے نظامِ ربوبیّت کو تسلیم کر کے، اس پر عمل بھی کریں، تو وہ ایمان والے ہیں۔ کفّار کے جواب میں خدا نے صرف یہ کہا کہ تمہارا یہ جواب صریح گمراہی پر مبنی ہے۔ کمبخت دیتے تو خود نہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ''یہ اللہ کا حکم ہے، ہم اس کے خلاف کیسے جا سکتے ہیں''۔

اِسی روش کو قرآن ابلیس کی روش سے منسوب کرتا ہے کہ جب اپنے اعمال کی جوابدہی کو دوسروں کی ذمہ داری پر ڈالا جائے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ (15:39)

''کہا (ابلیس نے) میرے رب! جیسا تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا''۔

یعنی اگر تو (اے خدا) نہ چاہتا تو میں (ابلیس) معصیت شعار کیسے ہو جاتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہی روش کفار و مشرکین کی ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے اعمال کا ذمہ دار اپنے آپ کو قرار نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اگر خدا کی مشیت میں ایسا نہ ہوتا تو ہم کفر و شرک کی روش کیسے اختیار کر سکتے تھے۔ سورہ انعام میں ہے۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ

قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (6:148)

جب تو ان مشرکین سے کہے گا کہ تم نے کیا روش اختیار کر رکھی ہے تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ خدا کی مشیت ہی ایسی تھی۔ اگر خدا ایسا نہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے آباؤ اجداد۔ ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کہتے ہو تمہاری اپنی قیاس آرائیاں اور جہالت ہے۔ حقیقت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

سورہ زخرف میں ہے کہ جب تم ان سے یہ سوال کرتے ہو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ:

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (43:20)

''اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہم بھی ان معبودان باطل کی عبادت نہ کرتے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو مجبور مانتے ہیں۔'' یہ یکسر جہالت ہے، حماقت ہے کذب ہے، افتراء ہے۔''

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ جبریت کے عقیدے کے حامل لوگوں کو قرآن کی رو سے کافر اور مشرک کے گروہوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

جبریہ قرآن کی مشیتِ اللہ کی اصطلاح کی تعبیر کرتے وقت انسانی ذات سے آزادیِ ارادہ کی نفی اور قدریہ اسی اصطلاح کی وضاحت سے انسانی ذات سے آزادیِ ارادہ کا اثبات کرتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ شروع ہی میں نظریہ جبر و قدر کا اللہ کی مشیت کے تناظر میں قرآن کی روشنی میں مُفصل جائزہ لیا جائے۔

مسئلہ جبر و قدر کے حل کا قرآنی موقف:

مسئلہ جبر و قدر میں جبریت کے بالمقابل انسان کے آزادی ارادہ کو قرآن بطورِ الحق پیش کرتا ہے اور اِس کی وضاحت اللہ کے تخلیقی اعمال کے اصولوں کے تین گوشے سامنے لا کر کرتا ہے۔

1۔ عالمِ امر: اِس میں صرف خدا کا ارادہ، عمل یا مشیّت چلتی ہے اور اِن سے متعلق کوئی خدا سے سوال نہیں کر سکتا کہ اس نے ایسا یا ویسا کیوں کیا۔

2۔ عالمِ تخلیق: اِس میں صرف انسان کے عمل کرنے کا میدان ہے، اس لئے اس میں کسی دوسرے، یہاں تک کہ خدا کے عمل کی بھی گنجائش نہیں یعنی یہ گنجائش خدا نے خود اپنے پاس نہیں رکھی۔ البتہ عالم خلق میں خدا کا قانون کارفرما ہے، جو انسان کے عمل کو نتیجہ خیز بناتا ہے۔

3۔ عالمِ انسانیت: اپنے قانون کو تو خدا نے مجبور پیدا کیا ہے، لیکن اِس تیسرے گوشہ میں انسان کو اختیار و ارادہ مل جانے کے بعد انسان خود مختار واقع ہوا ہے۔ چاہے تو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے، اور چاہے تو کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لے۔

یہاں اب ہم اِن تین گوشوں کی مزید وضاحت کریں گے۔

پہلا گوشہ عالم امر:

اِسے قرآن خدا کے ارادہ، عمل یا اس کی مشیّت کی کارفرمائی کا میدان قرار دیتا ہے۔ یہ وہ گوشہ ہے جہاں خدا کا قانون بنتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ آگ حرارت دیتی ہے، قانون یہ ہے کہ پانی پیاس بجھاتا ہے، قانون یہ ہے کہ سنکھیا موجب ہلاکت ہے اور قانون یہ ہے کہ شہد شفاء بخشتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ سنکھیا موجب ہلاکت کیوں بنایا گیا ہے، شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں دی گئی؟ اس ''کیوں'' کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے جیسا چاہا ویسا بنا دیا۔ یہ ہے فَعَالٌ لِّمَا یُرِیدُ یعنی وہ اپنے ارادے، اپنے پلان، اپنی مشیّت اور اپنی اسکیم کے مطابق جو قانون اس نے بنا دیئے ہیں، ان میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ یہ قوانین جب ہم وجود میں بھی نہیں آئے تھے، اس زمانے کے بن چکے تھے۔ جب کوئی بھی نہیں تھا، تب کے بن چکے ہوئے ہیں۔ پھر قوانین کو ایسا بنایا ہے کہ اِن میں خدا خود کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی دوسرا، ان قوانین میں کسی قسم کا تغیر و تبدّل کر سکتا ہے (48:23) عالم امر میں خدا کے عمل، خدا کے ارادے، خدا کی منشآ کو، خدا کی مشیّت کو فَعَالٌ لِّمَا یُرِیدُ اور یَفعَلُ مَا یَشَآءُ کہا ہے۔ عالم امر میں، صرف خدا کا ارادہ، عمل یا مشیّت چلتی ہے۔

عالم امر سے متعلق کوئی خدا سے سوال نہیں کر سکتا کہ اس نے ایسا یا ویسا کیوں کیا۔ عالم امر میں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو اس کی منشآ ہوتی ہے، وہ کرتا ہے، وہ اپنے ارادے کے مطابق کرتا ہے اور اس عالم میں وہ کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں ہے۔ عالم امر کو کائنات کا حصّہ بھی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ کیا ہے؟ اس کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا، البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عالم امر خالصتاً خدا کے عمل کرنے کا میدان ہے، اس کے علاوہ کسی اور کے عمل کرنے کا میدان نہیں ہے۔ البتہ خدا نے انسان کو انسانی زبان میں سمجھانے کے لئے کہا کہ جب وہ اپنے ارادے کو، اپنے پلان کو، اپنی اسکیم کو، اپنی منشآ کو کہتا ہے کہ ''کُن''، تو اس کا ارادہ بروئے کار آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ارادہ کس طرح بروئے کار آتا ہے، ہم نہیں جان سکتے۔ خدا سچ مچ ''کُن'' کا لفظ ادا نہیں کرتا، یہ تو خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے ایسا کہا ہے، ورنہ ہم عالم امر کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ عالم امر خالصتاً خدا کے عمل کرنے کا میدان ہے، کسی اور کے عمل کرنے کی اس میدان میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ''کُن'' کے بعد گوشہء کائنات یا عالم خلق آتا ہے۔

دوسرا گوشہ عالم خلق:

قرآن نے اس کے جواب میں اسی آیت میں کہا:

اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (36:47)

عالم امر میں خدا کا ارادہ، منشآ، پلان یا اسکیم ''کُن'' کہنے سے، جس شے کے حق میں بروئے کار آتا ہے، تو خدا کے ارادے میں پوشیدہ شے ''کُن'' کے فوراً بعد عالم خلق میں محسوس شکل میں آجاتی ہے۔ اور شے سے متعلق جو قوانین عالم امر میں بنائے گئے تھے، وہ بروئے کار آنا شروع ہو جاتے ہیں، جن کے تحت شے ارتقائی منازل طے کرتی ہے، اور آہستہ آہستہ شے

اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ عالم امر میں طے کردہ قوانین کے مطابق، شے عالم خلق میں ارتقاء کرنے اور زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس مرحلے کے متعلق خدا نے کہا:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (25:2)

اب (عالم خلق میں) ہر شے ہمارے قانون کے مطابق چلنے کے اوپر مجبور پیدا کر دی گئی۔

قانون بنانے کے بعد کہہ دیا:

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (48:23)

ہم نے جو پہلے ہی قوانین بنائے ہیں، اب ان میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

خدا کے قانون کے اس دوسرے گوشے میں ہر بات قانون کے مطابق ہوگی۔ یہ محسوس کائنات کا عارضی دائرہ ہے، جہاں اشیائے کائنات خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ انسان کی زبان میں انسانوں کو سمجھانا پڑتا ہے، اس لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس خدا نے یہ کہا کہ تم ہمارے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے 2/25 تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قانون کو طے کرنے کے بعد، خدا خود اپنے آپ پر جبر عائد کر لیتا ہے کہ میں اپنے قانون میں تبدیلی نہیں کروں گا۔ قانون اور اشیائے کائنات دونوں اب مجبور ہو گئیں کیونکہ خدا قانون میں تبدیلی نہیں کرتا اور اشیاء قانون سے ہٹ نہیں سکتیں۔ یہ خدا کے قانون کے بروئے کار آنے کا دوسرا گوشہ ہے۔

پوری کائنات میں خدا نے صرف انسان کو اختیار و ارادہ عطا فرمایا ہے، اس کو مجبور پیدا نہیں کیا۔ یہ چاہے تو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے، اور چاہے تو کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لے۔ یہ آزاد ہے۔ اسی لئے تو خدا نے انسان سے کہا اعملوا ما شئتم ''جو چاہو تم کرو''۔ لہٰذا عالم خلق میں خدا کا عمل نہیں، بلکہ اس کا قانون کارفرما ہوتا ہے۔ عالم خلق ،صرف انسان کے عمل کرنے کا میدان ہے اور عالم امر خدا کے عمل کرنے کا میدان ہے۔ اُس عالم امر کے میدان میں کسی کے عمل کی گنجائش نہیں ہے۔ عالم خلق صرف انسان کے عمل کرنے کا میدان ہے، اس لئے اس میں کسی دوسرے، یہاں تک کہ خدا کے عمل کی بھی گنجائش نہیں یعنی یہ گنجائش خدا نے خود اپنے پاس نہیں رکھی۔ البتہ عالم خلق میں خدا کا قانون کارفرما ہے، جو انسان کے عمل کو نتیجہ خیز بناتا ہے۔

تیسرا گوشہ عالم انسانیّت:

اپنے قانون کو تو خدا نے مجبور پیدا کیا ہے، لیکن انسان کو اختیار و ارادہ مل جانے کے بعد انسان خود مختار واقع ہوا ہے۔ چاہے تو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے، اور چاہے تو کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لے۔ اس کے اختیار و ارادے کا تو یہ عالم ہے کہ خدا نے خود اس کے متعلق کہہ دیا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (18:29)

''کہو الحق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے، جس کا جی چاہے ہمارے قوانین پر ایمان لا کر ان کے مطابق عمل کرے، اور جس کا جی چاہے ہمارے قوانین کا انکار کر دے۔''

صاحب اختیار اسے کہتے ہیں جس کے سامنے ایک سے زیادہ ممکنات (Possibilities) ہوں اور اسے اس کا اختیار ہو کہ وہ ان میں سے جو راستہ جی چاہے اختیار کرے جبکہ مجبور کے سامنے صرف ایک راستہ ہوتا ہے۔ اس اختیار کو حق انتخاب یا (Choice) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانی تخلیق کے متعلق کہا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾ (90:10)

اور ہم نے اسے دو راستے دکھا دیے ہیں۔

دوسری جگہ ہے کہ:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (76:3)

ہم نے اسے زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا۔ اب یہ اس کے اپنے فیصلے پر منحصر ہے کہ وہ اسے اختیار کرے یا اس پر چلنے سے انکار کر دے۔''

اسی کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (18:29)

ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ یہ کفار اور مشرکین (ابلیس کے اتباع میں) یہ کہتے ہیں کہ انسانی دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے۔ خدا کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے، جبکہ خدا انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ (41:40)

''تم جس طرح جی چاہے کرو۔''

یعنی ہم نے تمہیں صاحب اختیار ارادہ پیدا کیا ہے اس کے بعد ہم یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے معاملات میں دخیل ہو کر اور اپنی مشیت کو تم پر مسلط کر کے، تمہارے اختیار و ارادہ کو سلب کر لیں۔ اگر ہم نے اسے سلب کرنا ہوتا تو اسے عطا ہی کیوں کرتے۔ یہ تمہارا اپنی ذمہ داری سے فرار ہے جو تم صاحب اختیار ہوتے ہوئے اپنے آپ کو مجبور کہتے ہو۔ لیکن اس نے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ کے ساتھ، ایک اور بات بھی کہی ہے جس سے انسان کے اس اختیار کے بعد جبر کا ایک گوشہ سامنے آ جاتا ہے۔

اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (41:40)

تم جو کچھ چاہو کرو لیکن اتنا سمجھ لو کہ تمہارا ہر عمل ہماری بصارت میں ہے (تا کہ اس کے مطابق قانون مکافات کی رو سے نتیجہ مرتب کریں)۔

یعنی تمہیں اس کا تو اختیار ہے کہ تم جو کام جی چاہے کرو، لیکن جب تم سے ایک عمل سرزد ہو گیا تو اس کے بعد تمہیں اس پر اختیار نہیں رہے گا کہ تم اس کے نتیجہ کو روک لو یا اس میں تبدیلی پیدا کر دو۔ یہ چیز تمہارے حیطہ اختیار سے باہر ہو گی۔ دو راستوں میں سے کسی ایک راستہ پر چلنے کا تمہیں اختیار ہے لیکن اس کا اختیار نہیں کہ تم راستہ تو (الف) اختیار کرو اور چاہو تو پہنچ جاؤ اس منزل پر جس کی طرف دوسرا راستہ (ب) لے جاتا ہے۔ ہم نے تمہارے ہر کام کا نتیجہ مرتب کرنے کے لیے قانون متعین کر رکھا ہے پہل کرنا (Initiate) تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا قانون تمہارے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔

اسی حقیقت کی وضاحت حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ کرتا ہے کہ جب ایک جگہ طاعون پھیلا تو آپ نے کہا کہ اس بستی کو چھوڑ کر جنگل میں چلا جانا چاہیے۔

اس پر حضرت ابوعبیدہ نے کہا کہ افرار من قدر اللہ:

''کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا:

نعم۔ ہاں! افرار من قضاء اللہ الی قضاء اللہ ''میں خدا کی (ایک تقدیر) سے بھاگ کر (دوسری) تقدیر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔''

طاعون زدہ علاقے میں رہ کر اور اس طرح اس کی متعدی فضا سے متاثر ہو کر طاعون میں مبتلا ہو جانے کے خدشہ سے دو چار ہو جانا، یہ بھی خدا کی تقدیر (قانون خداوندی) کے مطابق ہوتا ہے اور اس جگہ کو چھوڑ کر صاف فضا میں چلے جانا اور یوں اس خطرہ سے محفوظ ہو جانا، یہ بھی خدا کی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ اب یہ چیز انسان کے اختیار کی ہے کہ وہ کونسی تقدیر اپنے اوپر وارد کرنا چاہتا ہے۔ اور صاحب عزم تقدیر کو اپنی مرضی کے تابع رکھتا ہے۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر واضح کیا ہے کہ جیسا انسان خود ہو جائے اسی قسم کا قانون اس پر منطبق ہو گا۔ ۔ بنی اسرائیل کی بے راہ رویوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ''جب انھوں نے ٹیڑھی راہیں اختیار کر لیں تو خدا (کے قانون مکافات) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔''

ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (9:127)

پھر وہ جب صحیح راستے سے پھر گئے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو پھیر دیا۔

سورہ النساء میں ہے کہ جو لوگ رسول کا اتباع اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کوئی راستہ اختیار کر لیتے ہیں تو

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (4:115)

''تو جن غیر المومنین کی راہ وہ اختیار کر لیتے ہیں ہم بھی انھیں انہی کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔''

اس کے برعکس:

فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ (2:152)

تُم مجھے یاد رکھو، مَیں تُمہیں یاد رکھوں گا۔

اسی طرح کہا گیا جو ہمارے دین کے شرف ومجد کے لیے مدد کرتا ہے، ہم بھی اسے صاحبِ شرف ومجد بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (47:7)

جو ہماری مدد کرتا ہے، ہم بھی اس کی مدد کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے آپ نے ملاحظہ کیا کہ انسان جو راستہ اپنے لیے تجویز کرتا ہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اِسے اپنے مخصوص انداز میں یوں فرمایا ہے کہ

رمزے باریکش بہ حرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی او دیگر است

خاک شو نذر ہوا سازد تُرا — سنگ شو بر شیشہ اندازد تُرا

شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست — قلزمی! پائندگی تقدیر تست

ترجمہ: اس کے لفظ میں ایک باریک ولطیف رمز (نقطہ) پوشیدہ ہے کہ اگر نسان (موجودہ روش کو چھوڑ کر) دوسری روش اختیار کر لیتا ہے، تو خدا کی (تقدیر) بھی اسی دوسری روش کے مطابق، انسان کے اعمال کی روشنی میں اپنے نتائج ثبت کرے گی۔ اگر انسان خاک (کی مانند) ہو جاتا ہے تو خدا کا قانون ہوا کی مانند اسے اچک کر لے جائے گا۔ لیکن اگر وہ پتھر کی مانند ثابت قدم رہتا ہے تو شیشے (حوادثاتِ زمانہ) اُس سے ٹکرا کر خود ہی چورا چور ہو جائیں گے۔ انسان کا شبنم کی صورت اختیار کر لینے میں اس کی تقدیر میں ناپائیداری اور سمندر کی صورت اختیار کر لینے میں پائیداری لکھ دی گئی ہے۔

قرآن ہی سے ہمیں بتایا گیا ہے کہ:

قرآن کا نظریہ اختیار وارادہ سے کئے گئے اعمال پر جوابدہی اور جزا وسزا کے اہل ہونے کا موقف:

قرآن نے انسان کو اپنے اعمال کا ذمہ دار، لہٰذا جوابدہ بنایا ہے وہ اپنے اختیار وارادہ میں آزاد ہے۔ جس سے مجبوراً بغیر نیت کئے ہوئے کوئی کام ہو جائے، اسے اس کا ذمہ دار ٹھہرایا نہیں جا سکتا۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (33:5)

اگر تم سے بھول چوک کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ گرفت اس کی ہوگی جس میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو۔

اس بناء پر قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ مجبور اور صاحب اختیار وارادہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے اسے سورہ

النحل میں مجبور اور صاحب ارادہ کی مثال سے مزید بات کی وضاحت کی ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (16:76)

یا مثلاً (خدا کی بیان کردہ یہ مثال کہ) دو آدمی ہیں۔ ایک ان میں سے ایسا ہے جو عمل و فکر سے عاری (گونگا) ہے۔ کسی شے کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ خود اپنی ضروریات کے لیے بھی اپنے آقا پر بوجھ ہے۔ اس کا مالک اسے جہاں بھی بھیجے وہ کبھی خیر کی خبر نہیں لاتا۔ (اس سے کوئی اچھی بات بن ہی نہیں پڑتی۔ وہ بے بس اور مجبور ہے۔ اس میں نہ کسی کو نقصان پہنچانے کی استعداد ہے نہ نفع پہنچانے کی طاقت)۔ کیا یہ شخص اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو خود زندگی کے توازن بدوش سیدھے راستے پر چلا جاتا ہے اور یہ معاملہ اپنے اختیار و ارادہ عدل کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کرتا ہے؟

سزا و جزا کی اہلیت کے ضمن میں بھی قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (53:39)

انسان کو وہی کچھ حاصل ہوسکتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

''کوشش'' کا محرک جذبہ، انسان کا ارادہ ہوتا ہے۔ اس لیے متعدد مقامات پر بتایا کہ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے کہ:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۗءِ وَهٰٓؤُلَاۗءِ مِنْ عَطَاۗءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَاۗءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20)

ہم نے اپنی بخشائشوں کے راستے میں بند نہیں لگا دیے۔ یہ تیرے رب کا عطیہ ہے، اسے روکنے والا نہیں ہے۔ وہ سب کے لیے کھلی ہیں جس کا جی چاہے اپنی سعی و عمل سے انھیں حاصل کرے۔

جو شخص دنیا کے مفاد عاجلہ حاصل کرنے کا ارادہ کرے، اسے ہم وہی مفادات دے دیتے ہیں اور جو شخص مستقبل کی خوشگواریوں کا ارادہ کرے اور پھر ان کے حصول کے لیے کوشش کرے تو ہم اسے اس کا مطلوب عطا کر دیتے ہیں۔ یہ جہاں سعی و عمل کا ہے، جس میدان میں کوشش کرتا ہے اس میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

سورہ النساء میں ہے کہ:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ (4:134)

''جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے ہاں دنیا اور آخرت (دونوں) کا ثواب ہے۔''

ان سب کے مطالعہ سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد ہے اور اسی وجہ سے اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی۔

(جاری ہے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546 Idara@toluislam.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

دوسروں کے لئے جیو

آپ نے کبھی کتے کی حرکتیں دیکھی ہیں؟ ایک کتے کو دوسرا کتا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اپنے جیسے کتوں کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ خود ہڈی پکڑ کر بیٹھا ہو تو گزرتے ہوئے ہر کتے کو غصے سے دیکھتا ہے۔ اسے اپنے جیسے کتوں کے ساتھ کوئی محبت نہیں ہوتی۔ مالک کا وفادار کتا دوسرے کتوں کی جان کا دشمن ہوتا ہے۔

کتے کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے۔ کوئی اجنبی کتا بھولے بھٹکے اس کی گلی میں آجائے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ خود بھونکتا ہے۔ بھونک بھونک کر گلی کے تمام دوسرے کتوں کو بلاتا ہے اور سب کتے مل کر اس مسافر کتے کو دور بھگا کر چھوڑتے ہیں۔

اب تک بات کتے کی ہو رہی تھی۔ تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ کتے کی یہ عادت بہت بُری ہے کہ وہ اپنے بھائی کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے کتے کو تکلیف پہنچا کر اسے خوشی ہوتی ہے۔ وہ خود حرص اور لالچ سے کھا پی لیتا ہے مگر دوسرے بھوکے کتے کو حصہ نہیں دیتا۔ اپنوں کے ساتھ اُسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔

اب تم تھوڑی دیر کے لئے کتے کی بات بھول جاؤ اور یہ سوچو کہ تم سے کوئی یہ کہے کہ فلاں شخص اپنے بھائی کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے آدمی کو تکلیف پہنچا کر اُسے خوشی ملتی ہے۔ وہ خود حرص اور لالچ سے کھا پی لیتا ہے مگر دوسرے بھوکے آدمی کو حصہ نہیں دیتا۔ اپنوں کے ساتھ اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔۔۔ تو ایسے شخص کے متعلق تم کیا سوچو گے؟

تم یقیناً کہو گے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ خود غرض آدمی ہے اور صرف اپنی ذات کا بھلا چاہتا ہے۔ حیوان اور انسان میں فرق یہی ہے کہ حیوان اپنی ذات کے لئے جیتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کا خیال رکھتا ہے اور بس۔ دوسرے کے فائدے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ انسان صرف اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی جیتا ہے۔

تم نے پڑھا ہوگا کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ کے دوران ہمارے لوگوں نے ''قربانی'' دی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے، ملک کے لئے اور قوم کے لئے اپنا آرام، اپنا مال بلکہ اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔

دنیا میں لوگوں نے دولت کے ڈھیر اکٹھے کئے۔ حکومت حاصل کر کے بادشاہ بنے۔ مگر دنیا نے یاد ان کو رکھا جو دوسروں کی خاطر زندہ رہے اور دوسروں کی خاطر مرے۔ خالد بن ولیدؓ، محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ اور موسیٰ بن نصیرؒ کے نام صدیوں سے عقیدت اور محبت سے لئے جاتے ہیں اور انہیں ہمیشہ اسی عزت اور پیار سے یاد کیا جائے گا۔

تم نے راشد منہاس اور عزیز بھٹی شہید کا نام تو سنا ہوگا۔ ان شہیدوں کا کمال کیا ہے؟ یہی نا کہ انہوں نے اپنے فائدے اور آرام کی پروا نہ کی بلکہ تن، من اور دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ محض اس خیال سے کہ قوم سربلند ہو اور وطن محفوظ رہے تاکہ اس میں اسلام کا بول بالا ہو سکے۔

دیکھنا یہ ہے کہ سکول میں اپنی جماعت کے کمرہ میں بنچ یا ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے تم کسی ساتھی یا ہم جماعت کو دیکھ کر اور پھیل جاتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ نہ بیٹھ سکے یا تم سکڑ کر اُسے خود پاس بیٹھنے کا کہتے ہو؟

بس میں سوار ہوتے وقت، ہلڑ بازی کرتے ہوئے، قطار توڑتے ہوئے، اندر داخل ہوتے ہو یا شرافت سے ان لوگوں کو پہلے چڑھنے کا موقع دیتے ہو جو قطار میں تم سے آگے کھڑے ہوتے ہیں؟ اور پھر بس میں پہنچ کر تم جلدی جلدی سیٹ پر بیٹھ جانے کی کوشش کرتے ہو یا کسی بوڑھے، معذور یا اپنے سے کسی چھوٹے کو سیٹ پر بٹھا کر خود کھڑے رہتے ہو؟

دوستوں اور ہم جماعتوں میں تم اپنی ہی باتیں کہے چلے جاتے ہو یا اپنی کہہ کر دوسروں کو بھی کہنے کا موقع دیتے ہو؟ گھر میں کبھی کوئی مٹھائی وغیرہ آتی ہے تو تم ضد اور لالچ کر کے اپنے حصے سے زیادہ کھا لینے کی کوشش کرتے ہو یا اپنے بہن بھائیوں میں بیٹھ کر محض اپنے حصے کی چیز کھا کر مطمئن ہو جاتے ہو؟

ایسا تو نہیں کہ گھر میں جو کچھ پکتا ہے وہ عام طور پر تمہیں پسند نہیں ہوتا اور ہر روز تم نئی چیز کی فرمائش کر دیتے ہو؟

ابّا اور امی کو تم ضد اور شور و غوغا سے پریشان رکھتے ہو یا ان کے کام میں ہاتھ بٹا کر یا اچھی اچھی باتیں کر کے ہی ان کا دل خوش کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

ایسا تو نہیں کرتے کہ جس امتحان میں فیل ہو جاتے ہو اس کی رپورٹ گھر لاتے ہی نہیں اور جھوٹ بول دیتے ہو کہ رپورٹ ملی ہی نہیں؟

چھوٹی بہن یا چھوٹے بھائی کو روتا دیکھ کر تم اس کا منہ چڑاتے ہو تا کہ وہ اور روئے یا اسے اٹھا کر اس کا جی بہلاتے ہو؟

اپنے کسی دوست، ہم جماعت یا ساتھی کو اداس دیکھ کر تم اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہو یا اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھتے ہو؟ اور اس کے ساتھ مذاق کرنے کی بجائے اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

تم کتنی بار ضرورت کے بغیر نئی کاپی، نیا قلم، نیا پنسل تراش یا نئی پنسل خرید لیتے ہو۔ آئندہ تم نے بلاضرورت پیسے خرچ کرنے سے بچنے کے لئے پکا ارادہ کر لیا ہے یا نہیں؟ پچھلی مرتبہ تمہیں جن باتوں کی پابندی کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا تھا اس پر تم نے کس حد تک عمل کیا ہے؟

یہ اور اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے تم اپنی جانچ پڑتال کر سکتے ہو۔ اس طرح کی جانچ پڑتال کر کے تم جہاں کہیں خرابی دیکھو، اُسے خود ہی ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔ کرو گے نا؟

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیرِ قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔ **ادارہ طلوع اسلام** نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بھجوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تا کہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تا کہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

اَلْحَمْد سے وَالنَّاس تک

مسلسل قرآنِ کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کا بالکل نیا انداز

مفہوم القرآن

(پرویز)

یہ نہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہے، نہ تفسیر بلکہ اِس کا مفہوم ایسے واضح، مسلسل، مربوط اور دِلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے قرآنی مطالب تابندہ ستاروں کی طرح نگہِ بصیرت کے سامنے اُبھر کر آجاتے ہیں۔

نیا اور کمپیوٹر کمپوزڈ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین امتزاج

طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 بی، گلبرگ 2، لاہور

tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com

www.facebook.com/tolueislam.trust

Phone: +92 42 35753666

***Manzil ba Manzil* (منزل بہ منزل)**

Chapter 3: Spring's Message (*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) –

Message to Fellow-Ambassadors

Episode No. 2

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959)

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

Unchangeable principles

At this point you must be wondering what these unchangeable principles are that form the basis of Islamic state and its constitution. It will take long time to explain the details of the permanent values. So, at this time, I will try to introduce to you some of these values so that you can see what their features are.

One concept of human life is that human beings are defined essentially by physical body which comes into existence according to physical laws. Its machinery remains alive according to physical laws and when this machinery stops working then its cells disintegrate. This is called death which ends human life. This concept of human life is called the materialistic concept of life.

Human self or personality

The other concept of human life is that it not only consists of human body but it has something else which is called "human self" or "human personality"; and which is not the product of any physical evolutionary process nor is it subject to any physical laws. This is granted to everyone by God; but it is given in undeveloped or potential form with the possibility that it can be developed and its potential could be realized. If it is developed and realized, then it does not die with the death of the physical body; but continues to live and marches forward on its onward evolutionary journey.

Just as there are laws for the development of the human body, there are laws for the development for the human self as well. These are the laws which are called by the Quran as unchangeable values or permanent values. If human leads his life according to these values then his self continues to develop. If he deviates from these values then his self becomes weak and disintegrates. However, humans cannot lead life at the individual level according to these values. These permanent values require that life be lived collectively under them which are constitutionally implemented and protected by law at the societal level in the Islamic state as a whole. Thus the Islamic state is nothing but the reflection of these values. The sole reason the Islamic state comes into existence is for the goal of facilitating the development of the human body *and* human *self*. Thus the Islamic state is *not* the end, but it is only a means to achieve this goal.

Therefore, the very first permanent value is human *self*. This value is the center around which all other values revolve. *This* is the foundation on which the structure of دین (*Deen*) is built. If someone believes in God who created this gigantic Universe and its laws according to which it is running so beautifully and smoothly, but does not believe in human self then his belief in God is meaningless. Belief in one's own self is a prerequisite condition for one to believe in God.

Human self has its own individual existence whose result is that every individual becomes accountable for his own actions – good or bad: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6:164) – Allah's law of requital is that no one else shall be responsible for what he does except his own self and no one shall be made to bear another's burden. And further: وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (2:48) – when the Quranic Order is established no one shall avail another in anything, nor shall any intercession of one for another be considered, nor shall any form of compensation be accepted neither shall they be succored. This is the principle according to which accountability for retribution or award occurs in Islamic state. Since human self is granted to every human equally, every child has equal respect by virtue of being a human child. وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ (17:70) – We have honored humankind. Honor and equal dignity for all human beings is an eternal principle that the whole world cannot change it. A child born in a palace and a child born in a slum have both equal dignity and honor by birth. In it, there is no difference between rich and poor; white or black; believer or unbeliever; nation or race; language or region; social or cultural characteristics.

[1] *Humanity means respect for human.* This is the fundamental eternal principle of the Quran. A constitution or law that protects this enteral principle will be called Islamic. If it deviates from this principle then it will be called non-Islamic.

Appointment to positions

After granting universal equal dignity to humans by birth, the Quran next addresses the basic principle in running the affairs of a good society. The Quran's decision regarding this is that: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6:133) – Allah's law is that everyone is assigned a position according to his deeds. No other consideration – wealth, status, race, family, influence of any kind etc. – should be given in this process. Moving this principle further we reach the level which the Quran describes as: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (49:13) – According to the Divine Law the criteria to determine status or superiority is how closely and

consciously one follows and guards the Divine Laws? And who obeys Him more? The one whose whole life is in conformity with this criterion is most worthy of respect. The person may either be man or woman, or from any family or tribe. The criterion for superiority is not race or status, but personal character and behavior.

Slavery

The necessary consequence of human honor and dignity is that no human being should be slave to another human in any form. Thus slavery, according to the Quran, is the worst crime of humanity. Leave aside humanity, it is not allowed for a human being to force others to follow his private orders. مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) – The fundamental principle of دین (*Deen*) is that no human being – even though Allah may have given him a Code of Laws or the power to enforce it or even given the position of the Prophet – has the right to say to the others: "You should obey me rather than Allah." Therefore, in Islamic state, the obedience will be to the laws only; and these laws are the ones whose structure is erected on the basis of Quran's permanent values. And these laws will apply to everyone equally. No exception whatsoever will be made to anyone no matter how great their position. The Quran declares the Prophet (PBUH) as the first one to submit to these laws: وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) – I been commanded and I am the first to submit to the commandment.

Justice

Equal application of law is called justice. What great emphasis the Quran puts on justice could be seen from this verse: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (5:8) – O people who believe, always stand up for justice in the cause of Allah. Let not the enmities of others towards you make you deviate from the path of justice. Always, and in all circumstances, act justly. This is akin to being righteous. Always adhere to the Laws of Allah Who is aware of all that you do.

احسان (*I'hsan*) or Mercy

Justice means giving one's due. But the Quran goes beyond this. It mentions احسان (*I'hsan*) along with justice: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (16:90) – Allah has ordered you to do justice with احسان (*I'hsan*) which is usually translated as mercy. But the root meaning of احسان (*I'hsan*) is: to restore balance and proportion. This is also the meaning of beauty – to have proper balance and proportion. If a thing's proper proportion is lost due to any reason then it no longer remains beautiful. The Quran commands that if someone's balance has

longer remains beautiful. The Quran commands that if someone's balance has been lost somehow, then restore his balance; and this way his beauty (as well as the beauty of the society) will be restored. Thus احسان (*I'hsan*) is also a permanent value of the Quran on which its universal system of sustenance rises for improving overall human condition. It is the duty of the Islamic state that it fulfill the basic needs of all; and facilitate the development of everyone's' latent potential equally. In other words, it will be the responsibility of the Islamic state and not that of the parents to make sure that every child's physical, mental, and emotional development takes place optimally without any discrimination.

Universal system of sustenance

Form this it is clear that if anyone sleeps hungry or if any child is left behind in a state then that state cannot be called Islamic. Caliph Umar (R) went so far as to say that even if a dog dies on the banks of Tigris due to hunger then he would be accountable for its death. The Islamic state will establish this universal systems of sustenance within its own dominion first, and then, it will expand it further and further until the entire earth will start shining from the universal light of its creator: وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا (39:69) – At that time the Earth (i.e., the human society) will glow with the effulgence of Allah's Law of Sustenance and every matter would be decided according to the Divine Code. And a state that will do this will tell its people: اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا (76:9) – And say to the people for whom they do all this, "We do not do all this as a favor to you. No, not at all! We do not expect anything in return; not even a word of appreciation. In fact, we are doing our duty; and our interest lies only in this. Accordingly, not only are our own "selves" nourished and developed, but that the Divine attributes grow in our personalities as well. This is the objective of human life." This is our life's duty that we have fulfilled. So, therefore, there is no question in this of any personal reward or appreciation:

The taste of patient suffering to improve human condition is itself the reward;
It is an insult to the lover of duty if it expects overt appreciation and reward!

Universal humanity

The intention to nourish others outside the Islamic state should not be for political exploitation or expediency or for making opportunistic alliances to strengthen its power; but it should be purely for the sake of belief that all human beings are members of one human family: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) –

Humankind is one single family. This is Quran's eternal and unchangeable principle. It is human greed and shortsightedness that that has divided this single human family into nations and races; and thus has fractured the humankind into umpteen pieces.

Standard for nationhood

According to the Quran there is only one standard for dividing humanity: those who believe in the permanent values of the Quran and make their attainment in real life as their life's mission. They are members of one party or Ummah, no matter what race they belong to and no matter where geographically they live on the planet. Those who reject this ideology are members of other party even if they live within the same country or state. In other words, according to the Quran, there is only one standard for nationhood based on commonality of ideology and not on commonality of country or of race. But it does not mean that one who is not a member of the Muslim Ummah is deprived of the public welfare of the Islamic state's universal system of sustenance. Never. Whatever human rights and benefits the Quran has given to humans by virtue of being humans – all humans are entitled to them and, therefore, one can demand them as of one's human right. This is the reason the Quran has said: وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25) – Thus by showing their generosity, they are in fact admitting the reality that their wealth is not only for their own use, but also for those whose resources cannot meet their needs; or those who became incapacitated and are unable to earn, thus being deprived of the necessities of life. This is their established right, which is well-known to everyone. Therefore the generous ones are only returning to them their right; and are not retaining anything which is beyond their needs. It is this eternal principle of transcending beyond race and country into one universal family of humankind about which the Quran proclaims in clear words: مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) – that which is of benefit to humankind abides on earth. In the words of Iqbal:

Selfish intellect is unmindful of welfare of others;
It only sees its own benefits, not that of others!

The revelation has its eye set on universal benefit;
It sees the welfare of all and everyone's benefit!

***

The philosophy of unity of humankind

At this place, my dear friends, there is a great point of Quran's wisdom that I do not want to move ahead without discussing it. The central focus of Quran's teaching is the unity of creator and the unity of the created. The society that the Quran wants to establish is based on the principle of the unity of humankind. For this purpose the Quran advocates that individuals lead a life by being a symbiotic part of the body of

the society. It does not allow classes within the society on any basis whatsoever. It declares the entire society (which is classless Ummah) as one unit. Then it instructs the Ummah that it should isolate itself from the rest of the world; but it should include others in its cultural and societal advancement.

There is no doubt that one of the purposes related the goal of unity of humankind is that world tensions resulting from political battles and economic confrontation should end. But there is a higher purpose beyond this. There is a peculiar principle of human evolution: that a nation which has reached advanced civilization and culture than other nations and it keeps its achievements only limited to itself, then its progress stops after reaching a certain point. But if it shares with and spreads its achievement and knowledge to other nations then its evolutionary advancement becomes limitless. In other words, according to Robert Briffault's anology, if cultural progress remains limited to an island surrounded by uncultured and uncivilized ocean, then its progress stops after reaching a certain point, and starts stagnating. In the same way if evolutionary progress is limited to only a group within a nation while the rest of its people are at the bottom of the evolutionary chain, then that group's progress stops after reaching a certain point and then starts stagnating. The higher evolution will only occur if the entire nation participates equally in it. According to the same principle, if an individual in a group reaches a higher level of knowledge and intellectual achievement, but does not use his position to help others in evolving to higher level, then his own evolution stops after reaching a certain point. This is the reason the Quran makes the individual part of the collective group, and the group part of the humankind. It does not let them remain separate.

Collective heaven

One cannot enter the Quranic heaven by leading individual life. The Quran tells: فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ (89:29-30) – You cannot enter this heaven individually, but only through collective living. For this it is important that you should join the group of believers (*Momineen*) who are obedient to Allah. And in this way you shall enter the blissful society of heaven, which has been established according to the Divine Laws. In that heaven it isn't the case that some part of it is heaven and the rest is hell. The Quran wants to create the same type of heaven in the world. Mysticism is wrong from the Quranic point of view because it advocates monastic life in which every individual is concerned with one's own spiritual progress and does not include the whole society in it. In the same way in the world of politics, the Quran rejects a political system in which one group dominates power and influence while the rest live below under them. Proceeding further, at the global and international level, the Quran declares a system against humanity in which one country advances so much ahead that it dominates the rest of the countries in the world. It declares that only that system is worthy of human respect in which all individuals are equal participants. If that is not the case then the progress of even the most developed country will stop and it will slowly lose its preeminence, and eventually will vanish into the dustbin of history.

To Be Continued...

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گرمدغم ہوجائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم رسول اللہ ﷺ کے بعد ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

UBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 71
ISSUE
10

Monthly
TOLU-E-ISLAM
25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

یہ وہ لوگ ہیں جو اُن تمام صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے رسول!) تجھ پر بذریعۂ وحی نازل کی گئی ہیں، اور جو تجھ سے پہلے پیغمبروں کو اُن کے اپنے اپنے وقت میں دی گئی تھیں (اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں) — اِن صداقتوں پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صحیح تاریخی شہادتوں سے اِس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اِس پروگرام پر اِس سے پہلے بھی کئی بار عمل ہو چکا ہے اور اس سے ہر بار وہی نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کا اب وعدہ کیا جاتا ہے، اس لیے اب بھی وہی نتائج مرتب ہوں گے — وہ اِس طرح اِس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اِس ضابطۂ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جدوجہد سے اِنسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے — وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔

(مفہوم القرآن سورۃ البقرہ:4)